

ایلیس

از

نمبر ۱۵

انٹریز

نسرہ احمد

یہ کہانی جو میں آپ کو سنانے جا رہی ہوں، یہ
میری کہانی نہیں ہے بلکہ میں تو صرف اس کہانی کی
ایک خاموش تماشاگر ہوں۔ میرا یعنی حلیمہ داؤد کا نام تو
اس داستان کے کسی پڑھنے والے کے لیے شاید یاد
نہیے کے لیے قابل نہ ہو مگر ان دو کرداروں کا ضرور
”کہا“ نہیں میں ان کے خوب صورت ناموں سے
جانتی ہوں۔
فلزہ ابراہیم اور رضا حیات خان۔
میں نے ان دلوں کو بہت قریب سے دیکھا
ہے اور ایسے دیکھا ہے جیسے کسی نے نہ دیکھا ہوگا اسی
لیے آج میں ایک بات کہنے کے قابل ہوئی ہوں۔ وہ
بات جس کو میں ہمیشہ جھٹلاتی تھی کہ شک کا نغمہ ہر

ایک کو نہیں دینا چاہیے۔ ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے اور جب وہ حد پار کر لی جائے تو اس اسٹیل اسٹالین کو شک کا فائدہ نہیں دینا چاہیے۔ اصولوں پر سمجھوتے نہیں کیا کرتے اور جو یہ کرتے ہیں وہ اپنے ساتھ بہت غلط کرتے ہیں۔

ہماری یہ کہانی قریباً سال بھر پہلے سے شروع ہوئی تھی جب میں اپنے ماسٹرز کے پہلے روز سائیکا لوجی کی کلاس لینے لگی تھی۔

☆☆☆

میں نے زندگی میں کبھی انتہا پین ڈراپ سائیکس نہیں دیکھا تھا جو اس روز کلاس میں چھایا تھا۔ گرو نہیں سمجھ رہے تھے اس شخص کی طرف اٹھی ہوئی نہیں جو ہمارے سائیکا لوجی کے پروفیسر تھے۔ پروفیسر... جو وہ کہیں سے نہیں نکلتے تھے میں بھی اس سمجھ رہی تھی کہ کڑیت کے ساتھ تھی اور ان سب کی طرح میں بھی کچھ نہیں لکھ پارہی تھی۔ نوٹس لینے کا ہوش ہی کسے تھا۔ وہ تھے ہی ایسے شخص کہ جن کے سامنے نگاہ ٹھہرتی نہ تھی۔

وہ دردمنم پکڑے، اپنے سنجیدہ انداز میں لپکھ دے رہے تھے۔ نیچے نقوش، خوب صورت آنکھیں، صاف رنگت، جیل سے پیچھے کیے بال، قیمتی اور نہیں اٹش کرے نوچیں میں ملیں، وہ بلا کے پیٹسم تھے۔ صرف وجہ بہت نہیں ایک اور کشش بھی ان کے اندر تھی جو مقابل کو آوندے مزہ گرا دیتی تھی۔ وہ کشش کیا تھی، میں اسے کوئی نام نہ دے سکی۔ بس کوئی مقناطیسی اثر تھا جو ان کے گرد پھیلا تھا اور اس مقناطیسییت سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔ کلاس ختم ہوئی تو سب کے لبوں پر ایک ہی نام تھا۔ سروضا حیات خان۔

اس روز مجھے پہلی دفعہ پروفیسر رضا کا نام معلوم ہوا تھا۔ وہ بیک تھے۔ اسہارت تھے اور ان کی جس مزاح بہت زبردست تھی۔ ان کے لپکھ میں کوئی بور نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ ان کی شخصیت کا فسون تھا اور کچھ

ملفوظات سائگرہ نمبر ۱۰۰ — اپریل ۲۰۱۲ء

کیا لگتا تھا وہ اپنے موضوع پر مکمل عبور رکھتے تھے اور وہ کبھی لاجواب نہیں ہوتے تھے۔ ان سے پوچھے جانے والے ہر سوال کا جواب سائل کو ہمیشہ بروقت ملتا تھا۔ عمر میں وہ زیادہ نہ تھے۔ ایم فل کیے ہوئے بھی انہیں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اور یونیورسٹی سے وہ پانچ برس سے غفلت تھے۔ ہم تو ان کے پرستار بن ہی گئے۔ ہمارے سینٹرز کا تو اور برا حال تھا۔ پورے ڈیپارٹمنٹ میں اگر کسی کا چرچا تھا تو وہ سر رضا تھے۔

ان سے میرا باقاعدہ تعارف ان کی دوسری کلاس میں ہوا جب انہوں نے تمام طلباء سے اپنا نام بتانے کی درخواست کی۔ جب میری پاری آئی تو میں قدرے جھک کر کھڑی ہوئی۔ ”سر میرا نام حلیمہ واؤد ہے۔“

انہوں نے جواباً مجھے ہلکی نرم سی مسکراہٹ دی۔ میں دھڑکنے والے دل کے ساتھ واپس نشست پر بیٹھی۔ ان کی وہ مسکراہٹ میری متاع جاں بن گئی۔ وہ میرے لیے مسکرائے، میرا نام سن کر مسکرائے... مجھے لگتا تھا میں کبھی اس لمحے سے نکل نہیں سکوں گی۔ مگر میرا دل... ابھی اور بہت سے لمحے آنے تھے۔

☆☆☆

اس روز باہر زوروں کی ہادش ہو رہی تھی اور اندر ہماری کلاس جاری تھی۔ آج وہ سائیکا لوجی سے ہٹ کر بات کرنے کے موڈ میں تھے اور ہم سمجھ لوگ تہ بند آنکھوں ان کی پیروی کیا کرتے تھے۔

”کون بتائے گا کہ انسان کی شناخت کن چیزوں سے ہوتی ہے؟“ وہ چہرہ قدرے جھکا کر مائیک میں بولے تو بہت سے ہاتھ فضا میں بلند ہوئے۔

”انسان کی شناخت اس کے نام سے ہوتی ہے۔“

”اس کے ملک سے۔“

”قبیلے یا ذات سے۔“

”رسم و رواج سے۔“

”زبان سے۔“

”اس کے کردار کی خصوصیات سے۔“

”کسی اچھے یا بُرے کا رتا سے۔“

وہ مسکرا کر ایک ایک کی سننے لگے۔ دنگٹا میں ملے اپنا کزور سا ہاتھ بلند کیا جانے اتنے لوگوں میں انہیں میرا ہاتھ کہاں سے نظر آگیا۔

”جی حلیمہ واؤد... آپ بتائیں، انسان کی آبادی شناخت کس شے سے ہوتی ہے؟“ بہت سی گردنیں میری جانب مھوئیں، میں نے یہ مشکل تھوک لگا سب کے سامنے بولنا میرے لیے ہمیشہ ٹھن رہا تھا مگر پروفیسر رضا کی ہمت افزا مسکراہٹ میرے اندر نئی روح پھونک گئی۔

”و... دین سے۔“ میں ہلکا کر بولی تو ان کے چہرے پر چمک سی آگئی۔

”فائنلی حلیمہ نے وہ بات کہی ہے جس کے سننے کا میں منتظر تھا۔ ہم شناخت کے معاملے میں دین کو کسے اسکپ کر سکتے ہیں؟ دراصل یہ سوشل سائنسز کا ایک اہم سوال ہے کہ جب ہم انسانی شناخت کی بات کرتے ہیں تو دین کو کیوں بھلا دیتے ہیں؟“ وہ اپنے لائوس پر کشش انداز میں ہاتھ ہلا کر کہہ رہے تھے اور میں بس اس ایک فقرے پر ہی ٹھہر گئی۔

”فائنلی حلیمہ نے وہ بات کہی ہے جس کے سننے کا میں منتظر تھا۔“ باہر گرتی بارش کے قطرے میرے دل کو بھگونے لگے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا میں ابھی وہ ”اں کی۔“

میں وہ تھی جسے جھوم تو کیا دو لوگوں میں بھی کڑی ہوں تو کوئی نظر اٹھا کر نہ دیکھے۔ چہرے پر نہ پہنے مگر حنائی والی چادر اوڑھے، میں بے حد

ابلیس

معمولی شکل کی لڑکی تھی۔ اگر کوئی میری موجودگی کو نوٹ کرتا بھی تھا تو شاید میری... جیسا کہ کے ہاٹ جس کے سہارے میں چلتی تھی۔ ایک حادثے میں کئی برس قبل میری دائیں ٹانگہ مفقود ہو گئی تھی اور اب میرا واحد سہارا میری چسما تھی۔ ایک کم شکل، معذور لڑکی کو کسی نے لمحے بھر کو تعریفی نگاہوں سے نوازا تھا، میں خود کو ہاتھوں میں تیرتا محسوس کرنے لگی تھی۔

شام کو جب میں اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تو خود سے باتیں کرنے لگی۔ ہر شخص خود دکھائی کرتا ہے۔ جو کہتا ہے کہ وہ خود دکھائی نہیں کرتا، وہ جھوٹ بولتا ہے، تنہائی میں، میں نے بھی اپنی ایک دنیا بنا رکھی تھی، جہاں میں معذور اور کم شکل نہ تھی۔ جہاں میری ہنگ اور تذلیل نہیں ہوتی تھی اور جہاں مجھے کوئی احساس کمتری نہیں ہوتا تھا۔ وہاں اس دنیا میں حلیمہ واؤد نہیں تھی۔ میں اپنا یاد دہانی۔ یہ نام بھی خود کو میں نے... ہی دیا تھا۔ یہ نام مجھے بہت پسند تھا۔ اپنا نام بدلنے کا اختیار نہ تھا مجھے اگر ہوتا تو بھی حلیمہ واؤد کے ساتھ میرا وجود بھی ٹکا ہوں کے سامنے گھوم جاتا تھا اور میں خود کو کبھی اپنا کا نام نہ دیتی۔

اپنا بہت خوب صورت تھی، بے تحاشا میرا اور شاعی خاندان کی اکلوتی اولاد۔ باپ کے اربوں کے پرنس کی اکلوتی جانشین اور یونیورسٹی کے ہراسٹوڈنٹ کے دل کی دھڑکن روکنے کا سبب۔ وہ جب چلتی تھی تو لوگ سحر زدہ سے ٹھہر کر اسٹ دیکھتے تھے۔ اس کے حسن، ذہانت اور دولت کے قصے ہر جگہ پھیلے تھے۔ وہ راجہ عالی کی شہزادی تھی اور اس جیسا کوئی نہ تھا۔

اماں کی آواز آئی تو میں چونگی پھر جیسا کہی سے خود کو کھینچتی باہر آئی۔ اماں کی آواز یونہی اکثر میرے ارد گرد تھرتھرتے ”اپنا یاد“ کے ستارتے بلبلے میں چہہ کرا سے پھاؤ دیا کرتی تھی۔

”جی اماں!“ میں نے بچن کے کھلے دروازے

ملفوظات سائگرہ نمبر ۱۰۰ — اپریل ۲۰۱۲ء

سے جھانکا۔ وہ بینک کے سامنے کھڑی
برتن دھو رہی تھیں۔ آواز پر پلٹیں۔

”تمہارے ماسوں آئے تھے آج پھر کرایے کا
تقاضا کر رہے تھے۔ سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔“ ان
کے چہرے پر پریشانی رقم تھی۔

ہم جس گھر میں رہتے تھے اس کا کرایہ باقاعدگی
سے ماسوں کو ادا کر دیتے تھے کہ نانا کی ملکیت تھا اور
ان کے بعد اب ماسوں اس کے مالک تھے۔ اماں کی
بیماری کے آغاز کے چند برسوں میں جب میں بہت
چھوٹی تھی ماسوں نے ازراہ ہمدردی ہمیں اس گھر میں
مفت رہنے دیا تھا۔ (جب وہ خود بھی ادھر ہی مقیم تھے۔
ایف سکس والے نئے گھر میں شفٹ ہوئے تو انہیں
پانچ، چھ، برس ہی ہوئے تھے بعد ازاں وہ ہم سے
کرایہ وصول کرتے گئے اور اب وہ ان چند سالوں کی
مفت کی رہائش کا کرایہ بھی مسکرا کر رائج الوقت کے پیمانے
پر طلب کر رہے تھے۔ ابو کی چھوڑی دو دکانوں کے
کرایے سے ہمارے گھر کا خرچ، مکان کا کرایہ اور
میری تعلیم کے اخراجات بہ مشکل پورے ہوتے تھے۔
اب یہ اضافی خرچ کہاں سے لاتے؟

کوئی اور دن ہوتا تو میں اماں کو تسلی دیتی مگر آج
میں خود بھی خاموش ہو گئی۔ شاید میں ذاتی طور پر اماں
کے پاس بہن میں تھی ہی نہیں بلکہ ابھی تک کلاس روم
میں تھی۔ جہاں پادش کے تراش گرتے قطرے بند
کھڑکیوں کے بیٹھوں پر لڑھک رہے تھے۔ اماں کافی
ویر اپنے مسائل کا ردنا روتی رہیں مگر جب میں خاموشی
سے خلا میں گھورتی رہی تو وہ شکست خوردہ سی اپنے
کاموں کی جانب پلٹ گئیں۔

ایک روز میں کلاس کے بعد لاہوری میں بیٹھی
پڑھ رہی تھی جب مجھے سامنے کھڑے بینک کے
بیچے سے مدغم سی آواز میں سنائی دی۔ لاشعوری طور
میں ان کی جانب متوجہ ہو گئی۔ وہ کسی اور کی نہیں بلکہ

146 ماحولیات کا کتبہ — اپریل 2012ء

پروفیسر رضا کی ہی آواز تھی۔

”آپ رومیں مت، آپریشن ہو جائے گا، میں
کہہ رہا ہوں ناکہ ہو جائے گا۔“ میں نے گردن ذرا سی
ترچھی کی۔ وہ بینک کے عقب میں کھڑے ہاتھ
اٹھا کر کسی کو تسلی دے رہے تھے۔

”سر آپریشن نہیں ہو سکے گا، ڈاکٹر نے آج کی
آخری تاریخ دی تھی۔ میری بہن مر جائے گی، مجھے
کچھ سمجھ نہیں آرہا۔“ وہ زندگی آواز میں بولتا دورین
تھا۔ میرا کلاس فیلو، میں نے سنا تھا اس کی بہن کی کوئی
بچیدہ سی سرجری ہونی ہے، کبھی وقت ہی نہیں ملا کہ
مزید تفصیل پوچھتی۔ ویسے بھی میں ان شریف لڑکیوں
میں سے تھی جو لڑکوں سے مخاطب نہیں ہوا کرتی تھیں۔
”اچھا روم نمبر کیا ہے اس کا؟“ وہ اس کے
شانے پر ہاتھ رکھے اپنے ازلی نرم انداز میں پوچھنے
لگے۔ دورین نے روم نمبر بتایا اور سر جھکائے، آنکھ کا
کنارہ انگلی کی ٹوک سے پونچھا۔ میں نے دیکھا،
پروفیسر کے چہرے پر سوچ کی گہری پرچھائیاں تھیں،
میں دھیرے سے سر جھٹک کر پڑھنے لگی مگر اب کتاب
کی طرف ذہن کہاں متوجہ ہونا تھا۔

بہ مشکل تین دن گزرے تھے کہ مجھے دورین
کیسپس میں ایک جگہ سیر میوں پر بیٹھا نظر آیا۔ ساتھ
اس کے دو تین دوست بھی تھے۔ اور وہ کسی بات پر
ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس رہے تھے۔ مجھے ذرا اچھٹیا ہوا
مگر خیر..... میں سر جھکائے، ہنساکھی سے خود کو گھسیٹتی
ان کے قریب سے گزر رہی تھی جب دورین کے
دوست کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

”بہت مبارک ہو دوری، میں گھر پر آئی
کو مبارک باد دیتے بھی آؤں گا۔“

”ہاں یار! میں بتا نہیں سکتا کہ کتنا مسکون
ہوں۔“ دورین کے چہرے پر بھی خوشی کھری تھی۔

”ارے ہاں، کچھ پچھلا کر آپریشن کی پے منت

میں نے کی تھی؟“

”نہیں..... مگر وہ جو بھی تھا، فرشتہ تھا میرے
بلے، اللہ اسے اجر دے۔“ اور ان سے دور جاتے
ہوئے میرے لبوں سے بے اختیار نکلا
تھا۔ ”آمین۔“ دورین بھٹے نہ جانتا ہو مگر میں جانتی
تھی کہ وہ کون تھے۔

☆☆☆

کچھ بدلے موسم کا اثر تھا اور کچھ میری نازک
طبیعت، مجھے ایسے نزلے زکام نے گھیرا کہ میں تین روز
تک ہونیورسٹی نہ جا سکی۔ چوتھے روز جب کلاس میں گئی
تو بھی زکام کی باقیات باقی تھیں۔ لیکن پھر کے اختتام پہ
اب میں کلاس سے نکلتی تو رضا حیات خان کا ریڈور
میں جیسے کسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ایک لمحے کو
مجھے اس پر رشک آیا جس کے انتظار میں وہ تھے۔ ان
لوگوں کے انتظار نے اس نامعلوم شخص کو کتنا محترم کر دیا
تھا۔

”علیہ واؤد..... کدھر تھیں آپ؟ میں آپ کا
ی انتظار کر رہا تھا۔“ میں ان کے قریب سے گزرنے
کی تو وہ مسکرا کر میری طرف بڑھے۔ میں ٹھٹک کر روک
گئی۔ وہ میرا انتظار کر رہے تھے؟

”جج..... جی پروفیسر؟“ میں سانس روکے
اٹھیں دیکھ گئی۔ وہ میرے بالکل سامنے آکر۔ ان
کے شاندار وجود سے کسی قسمی پر فہم کی سمجھ کر کن مہک
اٹھ رہی تھی۔

”تین دن کدھر غائب رہیں؟ میں تو پریشان
ہی ہو گیا تھا۔“

”مم..... میں ذرا..... وہ فلو ہو گیا تھا۔“

”اوہ..... اپنا خیال رکھا کرو، اسٹوڈنٹ کو بیمار
لگس پڑا جائے اور اتنے براٹ اسٹوڈنٹ کو تو ہرگز
لگس۔“ وہ مسکرا کر دھیمے لہجے میں کہہ کر پلٹ گئے.....
اور میں علیہ واؤد اپنے ست رنگے بلبلے میں مقید فضا

میں صبر نے لگی۔

دورین کہتا تھا کہ وہ فرشتہ ہے، مجھے لگتا تھا وہ
کوئی یونانی دیوتا ہے جو آسمانوں سے اترا ہے مگر شاید
وہ اس سب سے بڑھ کر کچھ اور تھے۔ وہ ساحر تھے ان
کے ایک اشارے پر مل کھاتی رسیاں سانپ بن جایا
کرتی تھیں اور مجھے ہر کہاں آتے تھے؟

ان دنوں مجھے لگتا تھا کہ دنیا میرے بلبلے کے
آس پاس کہیں غلیل ہو گئی ہے، سب فنا ہو چکا ہے اور

ماحولیات کا کتبہ — اپریل 2012ء 147

اگر کچھ باقی ہے تو میرا انتظار..... ہر روز

رضا حیات خان کی کلاس کا انتظار۔
انہیں ایک نظر دیکھئے، ان کی ایک مسکراہٹ حاصل کرنے کا انتظار اور پھر کلاس کے اختتام کے بعد اگلے روز کلاس کا انتظار شروع..... کبھی وہ مجھے دیکھتے، کبھی مسکراتے دیتے اور کبھی وہ اپنے ارد گرد کے جھگٹے میں اتنے معروف ہوتے کہ انہیں میں دکھائی نہ دیتی۔ وہ دن میرے لیے بہت اذیت ناک ہوتا تھا۔ جب ان کی نگاہ میری جانب نہ اٹھتی۔ اس دن مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ میں عجیب بیزاریت کی پیٹ میں رہتی۔

وہ دمبر کا ایک سرودن تھا جب میں اماں کے ساتھ کسی کام سے شاہین کیسٹ تک آئی۔ دکانوں کے سامنے سڑک پر خاصا رش تھا اور پرجوش جگہوں پر مجھے ویسے خوف آتا تھا۔ میں اپنی جیساگی کے سہارے خود کو کھینچتی فٹ پاتھ پر چلتی جا رہی تھی جب مجھے سڑک کے دوسری جانب ایک منظر دکھائی دیا۔

ایک جھلک، ایک گمان..... میں چونکی۔ وہ بلاشبہ رضا حیات ہی تھے۔ اپنے مخصوص حلیے سے ہٹ کر وہ جینز اور جیکٹ میں ملیں بڑے کنارے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بوڑھا شخص بھی تھا جو آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے سفید اسٹیک پکڑے، کچھ بولتا ہوا ساتھ ہی ہاتھ کے اشارے سے رضا کو کچھ سمجھا رہا تھا۔ رضا اثبات میں سر ہلاتے اسے بغور دیکھ رہے تھے پھر وہ اس عمر رسیدہ شخص کا ہاتھ تھام کر آگے آئے اور احتیاط سے دو طرفہ بہتی ٹریفک کے درمیان سے گزرتے اسے سڑک پار کرانے لگے۔ چند ہی لمحوں بعد وہ دونوں سڑک کے اس طرف پہنچ گئے۔ بوڑھے کو زری سے کچھ سمجھا کر، اب وہ جانے کی اجازت مانگ رہے تھے۔ وہ عمر رسیدہ تاجینا شخص دونوں ہاتھ اٹھا کر انہیں دعا دے رہے تھے۔ رضا بہت ممنون، بہت شرمندہ سے واپس ملنے۔ میری نگاہوں نے اس وقت

تک ان کا تعاقب کیا جب تک کہ وہ واپس اپنی کار میں نہ بیٹھ گئے پھر میں مسکرا کر ہولے سے سر جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

کہاں ہوتے ہیں آج کل ایسے لوگ؟

☆☆☆

”ٹک کا فائدہ ہر ایک کو دینا چاہیے۔ میں اس بات سے متفق نہیں ہوں۔ کیا آپ ہیں؟“ کلاس میں سکوت چھایا تھا اور وہ اپنے ازلی سحر انگیز انداز میں بوجھ رہے تھے۔ ہر ذی نفس خاموش، ساکن بیٹھا رہا۔ کسی کو ان سے اختلاف نہیں تھا، سوائے میرے۔

”میں ہوں۔“ میں نے اپنا کمزور ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ وہ ذرا چونکے شاید حیران ہوئے تھے۔

”حلیہ داؤد؟“ وہ جیسے یاد کر کے بولے۔
”ہماری یہ سب سے پرائیٹ اسٹوڈنٹ اس بات سے کیوں متفق ہیں، ہمیں بتائیں پلیز؟“

یہ مبالغہ آرائی تھی، میں بہت ابورج سی طالبہ تھی اور یہ بات سب جانتے تھے معلوم نہیں وہ کیوں مجھے اتنی اہمیت دیتے تھے۔ یا پھر وہی دیکھتا ہے جو وہ دیکھنا چاہتا ہے۔ مجھے لگا میں بھی دیکھ رہی ہوں۔
”سرمیرا خیال ہے کہ ہر شخص کو ٹک کا فائدہ دیا جانا چاہیے اگر آپ نے کچھ آنکھوں سے دیکھا یا نہیں دیکھا تو بھی بجائے کسی کو فوراً امور و ائرام ٹھہرانے کے اسے ٹک کا فائدہ دے کر بری الذمہ قرار دیا جائے۔“

”آپ کو کیا لگتا ہے حلیہ کہ آپ کا یہ آرگومنٹ کن جگہوں پر اپلائی ہوتا ہے؟“ ہال میں خاموشی چھائی تھی اور وہ ڈانٹ پہ کہیاں رکھے پوری سنجیدگی سے میری جانب متوجہ تھے۔ اودھ خدا یا، وہ کتنے پنڈت تھے۔

ہر اس جگہ پہ جہاں کسی انسان پر ہمیں کسی ممانہ ٹک ہوتا ہے۔“

میں نے انسان؟“ وہ ہولے سے مسکرائے۔ میں نے گڑ بڑائی۔

”آف کورس، ہم انسانوں کی ہی تو بات کر رہے ہیں۔“

”مگر آپ نے گناہ کا ذکر کیا تو گناہ ایک اور طبقہ سے بھی سرزد ہوتے ہیں۔“ میں الجھ کر انہیں کہنے لگی۔ جانور، درندے، پودے، حشرات الارض میرے ذہن کے پردے پر ایک ایک کر کے کئی ام آتے گئے۔

”جنات؟“ میری خاموشی پر انہوں نے کہا تو ہارے ہال میں ایک عجیب شخصی سی دوز گئی۔

”جنات؟“ میں ہولے سے بڑ بڑائی۔

”جی ہاں، جنات..... اور یہ جو بیک سچڑ ہیں ان کو منہ بنانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، میں یہاں آپ کو کوئی ہار اسٹوڈنٹ نہیں منانے لگا۔“ ان کے ہرے کے تاثرات جیسے ہی سخت ہوئے آخری نشستوں پر بیٹھے سارے لڑکے حیر کی طرح سیدھے ہوئے پھر وہ میری جانب متوجہ ہوئے۔ ان کی آنکھوں میں لٹی کی جگہ نرم تاثر نے لے لی۔

”تو حلیہ داؤد اگر گناہ کی بات ہے تو کیوں نہ بات کا ذکر کیا جائے؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر پھر رہے تھے اور مجھے لگا میں نے اختلاف میں غلطی مان لے لی ہے۔

”ہزاروں برس پہلے ایک جن ہوا کرتا تھا، ابو ان، جنات کا باپ۔ اس کا نام عزازیل تھا۔ وہ انسانوں کا سردار تھا۔ مکرم تھا، مجتہد تھا۔ اس سے زیادہ لکھ اور پارسا کوئی نہیں تھا۔ وہ سب سے بڑا عبادت گزار تھا پھر کیا ہوا؟ آپ بتائیے حلیہ داؤد پھر کیا ہوا اس عزازیل کو آج آپ انہیں کے نام سے یاد لے رہے ہیں؟“

میری ہتھیلیاں پسینے سے بھیگ گئیں۔

ابلیس

”اس نے آدم کو مجھہ کرنے سے انکار کیا تھا..... یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس نے اللہ کا حکم ماننے سے انکار کیا تھا، نہیں؟“
”جی..... جی۔“

”اس نے کیوں کیا وہ سب؟ کیوں وہ انسان سے حد کا شکار ہوا؟ کیا، اس کے تکبر بھرتے انکار کی کوئی وجہ ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔“
ہال میں سناٹا پھایا تھا۔ سب دم سادھے انہیں سن رہے تھے۔

”ابلیس نے جو بھی کیا وہ میں ہی کیا اور وہ آج بھی بہت سے انسانوں کو اپنے جیسا ”ابلیس“ صرف اس لیے بناٹا چاہتا ہے کہ اللہ انسان سے محبت نہ کرے۔ آپ نے کبھی سوچا کہ ٹک کا فائدہ اللہ نے ابلیس کو کیوں نہیں دیا۔ باوجود اس کے کہ اللہ سے بڑھ کر مہربان کوئی نہیں ہے؟“

وہ مجھے دیکھ کر استفسار کر رہے تھے اور میں بنا پلک جھپکے سانس روکے اجنبی دیکھ رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا میری آواز کبھی نہیں نکل پائے گی۔

”وہ اس لیے ڈیڑھا اسٹوڈنٹس کہ ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے جب وہ حد پار کر لی جائے تو پھر اس شخص کو رعایت نہیں دی جاسکتی۔ بعض اصول ایسے ہوتے ہیں جن پر سمجھوتا نا ممکن ہوتا ہے۔ سوائی زندگی میں ایسے اصول بنائیں کہ اگر کوئی انہیں توڑے تو آپ اس ابلیس کو کوئی رعایت نہ دیں۔ عزازیل ہر کوئی بن سکتا ہے مگر جو عزازیل سے انہیں بنے وہ بندگی کی جنت سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا جاتا ہے۔ اس کی کبھی واپسی نہیں ہوتی۔“

میں نے بے اختیار دونوں ہتھیلیاں اٹھا کر تالی میں ملائیں اور ایک دم پورا ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔
”اودھ کم آن اسٹوڈنٹس!“ وہ جھینپ کر نیپل پر رکھی کتاب کی طرف متوجہ ہو گئے۔

ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے ایک بہت پرانے پروفیسر سر عثمان راؤ ان دنوں ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کے اعزاز میں ایک شاندار سیٹھی فیئر ویل پارٹی کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جس پر تمام سیٹھی ممبران اپنے ازدواج کے ساتھ مدعو تھے۔ اس شام میں نے پہلی دفعہ پروفیسر رضا کی بیوی کو دیکھا۔

اس کا نام علیہا تھا۔ وہ دراز قد اور بھورے کھنکھرائے بالوں والی بے تمنا حسین لڑکی تھی۔ جیسے موسم کی گڑیا۔ رضا بلیک ڈنرسوٹ میں ملبوس تھے اور وہ ان کے ساتھ سیاہ اسٹاکش لباس میں پورے اعتماد کے ساتھ کھڑی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ کوئی اتنا حسین بھی ہو سکتا ہے؟ پانچ برس کا بیٹا اس جیٹا ماں کی انگلی تھامے کھڑا تھا۔ وہ تینوں ایک ساتھ اسے مکمل لگ رہے تھے کہ میں پوری تقریب انہیں نکلے مٹی۔ مجھے ان کی بیوی اچھی لگی تھی، وہ انہی کی طرح بے حد مفساد اور شائستہ تھی البتہ میرا ان سے تعارف نہ ہو سکا کہ یہ وہ موقع تھا جب رضا کے ارد گرد گئے جھگٹنے کے پیچھے میں میسج جابا کرتی تھی۔

وہ تینوں ایک تصویر کھینچوانے کے لیے ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے اور کمر پکڑے ذورین کے کہنے پر مسکرائے فلیش کی روشنی میں ان کی کاسلیٹ اور بھی دکنے لگی۔ کھٹا کھٹ بہت سے اسٹوڈنٹس ان کی تصاویر لینے لگے اور وہ ریڈ کارپٹ پہ فوٹو شوٹ کروانے والے استاد سلیم پٹر کے مانند ہر طرف کیمرہ اور فلیش کی چکاچندرو وشنیوں سے گھر گئے۔ اپنے موبائل سے بہت دور سے ایک تصویر میں نے بھی لی تھی۔

اس رات میں اس تصویر کو دیکھ کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ کیا مجھے تاملے کی ضرورت ہے کہ کیوں؟

کارڈور میں اسٹوڈنٹس آ جا رہے تھے۔ ہم اپنی میسج کی سے خود کو کھینچتی آہستہ آہستہ اس آ دروازے کی جانب بڑھنے لگی جس پر مصاحبات خا کے نام کی تختی لگی تھی۔

دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے دو دفعہ کھٹکھٹایا پھر وہ نہ پا کر ذرا سا دھکیلا تو وہ کھٹکھٹا چلا گیا۔

ان کی کرسی خالی تھی۔ البتہ ایک خالی کونے وہ جاننا بڑھانے نماز پڑھ رہے تھے۔ جس پہلے نے دروازہ کھولا وہ اسی پہلے سجدے میں گئے۔ میرا احترام سے بھر گیا۔

ان کے سلام پھیرنے تک میں چوکھٹ ٹر کھڑی رہی۔ وہ فارغ ہوئے تو سر اٹھایا۔ چہرے حیرت آگئی۔

”میری اتنی برائٹ اسٹوڈنٹ اسے تکلف ابھی تک دروازے پر کھڑی ہے۔ اس بات کا مجھے افسوس ہے۔ آئیں، بیٹھیں نا۔“ وہ تاسف ونداسے سے جا نماز نہ کرتے اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے لیے کرسی کھینچی۔

”سوری پروفیسر! میں لب کا قتی دروازہ بند کے کرسی تک آئی۔ وہ اب گھوم کر میز کے پیچھے جا اپنی ریلو الونگ چیر پر بیٹھ رہے تھے۔ ان کا کوٹ کر کی پشت پر دکھا تھا اور وہ شرٹ کی آستینیں کہنیوں سوڑے۔ تاکی کی ٹاٹ ڈھیلی کیے بہت بے تکلف رہیں۔

”لائیں کتاب دکھائیں، کون سا ناپک سمجھا آپ نے؟“ وہ میرے ہاتھ سے کتاب لے کر پلٹنے لگے۔ ”مج کا اس کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ مجھے ایک موضوع کے سمجھنے میں دشواری ہے انہوں نے فوراً مجھے ایک بجے اپنے آفس میں لے گیا تھا۔

”تو اس میں کیا سمجھ نہیں آیا آپ کو؟“ مسلم

الہامی کراپ وہ اس پر سرسری نگاہ دوڑاتے ہوئے رہے تھے۔

”سر یہاں سے آگے۔“ میں آگے ہو کر انگلی لگاتے لگی۔ یہ مشکل دس منٹ لگے انہیں مجھے صحنے میں، اور ساری باتیں میری سمجھ میں لیں۔

”اب بتائیں چائے لیں گی یا کافی؟“ کتاب کر کے انہوں نے ایک طرف دکھ دی۔

”دونوں نہیں۔“

”پھر جس تو لیں گی ہی۔“ وہ اٹھے اور سائڈ پر لگی ٹرے سے ایک کین اٹھا کر کھولا اور ایک شیشے کے گلاس میں اٹھایا۔

”تھینک یو۔۔۔ آپ کی دانت بہت اچھی ہیں پروفیسر۔“ میں نے اورنگ جوس کا ایک کھونٹ بھر کر اس میز پر رکھا۔

”جانے بھی دو حلیمہ واؤر۔“ انہوں نے ایک اس مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا۔ میں ٹل رہی تھی۔

”کیوں پروفیسر۔۔۔ کیا ہوا؟“

”اچھی مسلمان لڑکی وہ ہوتی ہے جو سڑھا نہ لے، لاپ پہنے۔ اب آپ ہیں، مجھے آپ بالکل اپنی چھوٹی لہن کی طرح لگتی ہیں۔ اور سڑھکے تو آپ بہت اچھی لگی ہیں۔ مگر میری بیوی۔۔۔“ ایک تنگ مسکراہٹ ان کے چہرے پر کھڑی تھی۔ ”میری بیوی میری نہیں آئی۔“ ان کا مجھے اپنی چھوٹی بہن کہنا مجھے متبر کر گیا ان کی بیوی کا رویہ دیکھی۔

”وہ ایسے کیوں کرتی ہیں؟“

”غور۔۔۔ اپنی ذات کا ذمہ، کچھ اپنے باپ کی بات کا کھبر، ایک عام سے پروفیسر سے اتنے بڑے پکی بنی شادی کرے گی تو وہ برابری پہ تو کبھی نہیں کہے گی۔“

”ارنج میرج تھی؟“ میں اس وقت سب کچھ

اہلیس

سوچنا چاہتی تھی سوائے اس کے کہ میں بہت پرست ہو رہی ہوں۔

”اونہوں۔۔۔ لومیرج! پور کے لڈو۔“ ان کا وجہ چہرہ حزن و اداسی سے بڑھا۔ میرا دل کٹنے لگا۔

”میں آپ کے لیے کچھ کر سکتی ہوں؟“

”ہاں نہیں حلیمہ۔۔۔ میں اپنے لیے خود کچھ نہیں کر سکتا تو تم کیا کرو گی۔ بعض دفعہ زندگی ایک مقام پر ٹھہر جاتی ہے، کچھ نہیں آتا کہ کس طرف کو نکلیں۔

آگے یا پیچھے، ایسے میں اگر کوئی دل کا بوجھ ہٹا کر دے تو اچھا لگتا ہے۔ تم سے بات کر کے بھی اچھا لگا۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔“ پھر وہ میرے ساتھ لگی پھلکی دوسری باتیں کرنے لگے۔

وہ ساتتیس میری زندگی کی سب سے قیمتی متاع بن گئیں۔ ان کے آفس سے نکلتے وقت میرے ارد گرد میرا دست رنگا پلیمہ تن چکا تھا۔ میں اسی میں مقید فضا میں تیرتی رہی تھی۔ میں جاگتی آنکھوں سے دن کی روشنی میں کوئی بار بار پاتا اور بنی تھی۔

اس روز میں نے پہلی دفعہ ایک چھڑا بنایا تھا۔ البتہ یہ بات میں اس وقت نہیں جانتی تھی۔

☆☆☆

گھر پہنچی تو اماں رو رہی تھیں۔ ماموں آج بہت سی باتیں منا کر گئے تھے۔ ان کی مطلوبہ رقم کا انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ اور وہ اب مجھے اور اماں کو سامان سمیت مکان سے باہر پھینکنے کی دھمکی دے کر گئے تھے۔

”خون سفید ہو گیا ہے کراہت بھائی کا۔“ اماں کو ماں جانے کی بے بسی رلا رہی تھی۔ میرا دل بھی دکھ میں گھرتا گیا۔ عجیب مایوسی کا عالم تھا۔ پریشانی کے باعث رات میں اماں کی حالت بگڑتی گئی تھی۔ بخار نے ایسا آن گھیرا کہ غشی کے دورے پڑنے لگے۔

رات کے تیسرے پہر وہ یہ مشکل دوا سے کچھ

ماحولیات بیکورہ — اپریل 2012ء (155)

سنبھلیں تو میں باہر برآمدے میں آٹھنٹھی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ پریشانی اور پریشانی ہر مسئلے کے آخر میں اگر مجھے کوئی ایک فیصلہ نظر آتا جو میری مدد کر سکے تو وہ رضاحیات تھے۔ کیسے اور کیوں، میں نہیں جانتی تھی۔ صبح کے چار بجے بالآخر دل کے ہاتھوں ہار کر میں نے موبائل اٹھایا اور رضا کا نمبر ملا یا جو انہوں نے مجھے آفس میں دیا تھا۔ دوسری گھنٹی پہ فون ریسیو کر لیا گیا۔

”علیمہ دادو نے اتنی جلدی مجھے کیسے یاد کر لیا؟“ وہ اتنا ہشاش بشاش تھے کہ میں لمبے بھر کو اپنا مسئلہ بھول گئی۔

”آپ جاگے ہوئے تھے؟“

”ہاں، ابھی تہجد پڑھ کر فارغ ہوا تھا۔ تم بتاؤ، کیسی ہو؟“ جواب میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تو دل بھر آیا۔ گلا رندھ گیا۔

”علیمہ..... تم دور رہی ہو؟“ وہ فکر مند ہو گئے تھے۔ میں آنسوؤں اور سسکیوں میں سب کچھ کہتی چلی گئی..... آخر میں وہ دھیرے سے ہنسنے لگی۔

”اتنی سی بات.....؟ اور میں سمجھا کہ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔“

”یہ اتنی سی بات نہیں ہے۔“

”ہے..... بالکل ہے..... اور یہ مسئلہ صبح تک حل ہو جائے گا۔“ ویسے کہ ہر رچے ہیں تمہارے ماموں؟“ بے خیالی میں، میں نے ماموں کا ایڈریس اور نمبر دے دیا۔ پتا نہیں وہ ان کو کیسے سمجھائیں گے۔

”میں صبح تک میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ اچھا بتاؤ، تم نے رات سے کچھ کھایا یا نہیں؟“

”نہیں۔“

”پھر میں ہولڈ کرتا ہوں، جاؤ لیکن میں اور کچھ پلیٹ میں لے کر آؤ پھر باتیں کرتے ہیں۔“

”اچھا۔“ میں نے فون رکھا اور سکرول کرتے ہوئے

انہی۔ مجھے اپنے بھاری کندھے ہلکے ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

اس صبح ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ بچپن اسکول کے زمانے کی، اپنی اپنی فیملیز کی، گھر دوستوں کی۔ مجھے وہ بھی اپنی طرح اکیلی اور اندر زمانے کے ڈبے ہوئے لگے تھے۔ میں بہت آہستہ ان بہت قریب آ گئی۔

اور پھر اس صبح وہ پونہ دس بجے نہیں آئے۔ شام ماموں نے اماں کو شکریہ کا فون کیا کہ ان کو ہمارے پیسے بندے نے پیسے ادا کر دیے تھے۔ اماں نے ہمیں ان کو تو نہیں البتہ مجھے ضرور کہا۔

”کس نے ادا کیے پیسے؟“

”ایک دوست نے مدد کی ہے۔ میں اسے دوں گی۔“

”مگر.....“

”آپ آم کھائیں، چمچ کیوں نکلتی ہیں؟“

چپ ہو گئیں مگر اگلے روز جب میں نے رضا سے واٹس کی بات کی تو وہ ”ارے چھوڑو“ کہہ کر بات نہ لگے۔

”میں نے اصرار کیا تو وہ شرمندہ ہونے لگے۔“

”اگر اب تم نے پیسوں کی کوئی بات کی تو کبھوں گا کہ علیمہ دادو میری سب سے برا اسٹوڈنٹ نہیں ہے۔“ اور پھر میں نے پیسوں کی بات نہیں کی مگر..... مگر واقعی..... دیکھیں میں واقعی پیسوں کی کوئی بات نہیں کی تھی پھر بھی.....

”کیوں..... کیوں چند روز بعد مجھے علم ہوا کہ میں سب سے برا اسٹوڈنٹ نہیں ہوں؟ یا شاہ ری؟“

کیوں نہیں رہی اور کب سے نہیں رہی؟

ہاں، تب سے جب قلزہ ابراہیم زندہ گیوں میں آ گئی۔

قلزہ..... وہ میرا جوڑا تھا نہیں، صرف نونا

۔ والد نونے تو پھر کبھی جڑ نہیں سکتا۔

☆ ☆ ☆

”قلزہ ابراہیم، ٹالس نیم..... مگر کلاس کو یہ تو نہیں کہ قلزہ کا مطلب کیا ہوتا ہے؟“ پوری کلاس ہل سنا چھایا تھا اور بہت سی نگاہیں رشک و حسد سے رضاحیات کی مخاطب کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ لیٹ ایڈمیشن تھی۔ دیر سے آنے والے مگر رہا جانے والوں میں سے تھی۔ کامنی سی لڑکی، بے حد گوری ملائم جلد اور لانی آنکھوں کی مالک۔ اس کے ہاتھ کمر تک گر رہے تھے۔ سیدھے، سلیکی سیاہ بال اور وہ ہلکے آنکھیں سمیٹ کر دائیں شانے پر آگے کو ڈال دیتی تھی۔ اس کا لباس بھی بہت جدید تراش خراش کا،

نورے بے ہاک سا تھا۔ آستین، نقاب، کھلا گلا اور گردن سے لپٹا دوپٹا..... وہ بہت خوب صورت تھی، ازگ کی کسی ادھ کٹے پھول کے مانند جسے چھونے سے بھی میلے ہونے کا خدشہ ہو۔

”قلزہ یعنی ڈائمنڈ؟“ وہ اپنی نازک، لمبی گردن سے اٹھائے ہوئی تو رضا حیات دھیرے سے حکمرانے۔

”ڈائمنڈ..... جوڑا حلتا نہیں صرف ٹوٹتا ہے؟“

”اور اگر ایک دھبہ پڑے تو پھر کبھی نہیں جڑتا۔“

ہم اسی طرح چلتے سے ہوئی۔

”آپ نے اتنا لیٹ ایڈمیشن کیوں لیا؟“

”جواب قلزہ نے نزاکت سے شانے اچکائے۔“

”میں نے اچکائے کا اپنا ایک متغیر داغ انداز تھا۔“

”موڈ نہیں بنا۔ بس۔“

”چلیں، اچھا ہے کہ اب موڈ بن گیا تو کلاس! قلزہ ابراہیم سے۔ ہماری مستقبل کی برا کھیلٹ ادا ہے۔“

میں گری طرح چمکی مگر رضاحیات میری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ قلزہ کی جانب متوجہ تھے۔ آج

استاد کی قدر و عظمت

فائنل عالم سکندر ایک مرتبہ اپنے استاد ارسلو کے ساتھ گئے جنگل سے گزر رہا تھا۔ راستے میں ایک بہت بڑا برساتی ٹالا آ گیا۔ ٹالا پارش کی وجہ سے طوفانی پراپا ہوا تھا۔ استاد اور شاگرد میں بحث ہونے لگی کہ خطرناک ٹالا پہلے کون پار کرے گا۔ سکندر بھند تھا کہ پہلے وہ جائے گا بالآخر ارسلو نے اس کی بات مان لی۔ پہلے سکندر نے ٹالا پار کیا پھر ارسلو نے ٹالا عبور کر کے سکندر سے پوچھا۔ ”کیا تم نے پہلے ٹالا پار کر کے میری بے عزتی نہیں کی؟“ سکندر نے ادب سے جواب دیا۔ ”نہیں استاد مکرم، میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ ارسلو رہے گا تو جہاں ارسلو تیار ہو سکتے ہیں لیکن سکندر ایک بھی ارسلو تیار نہیں کر سکتا۔“

مرسلہ برزنت تین دفن کرانچا

مجھے ان کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے لیے کسی ہجوم کی ضرورت نہیں تھی۔ قلزہ پورے ہجوم پر بھاری تھی۔

مگر میں فیصلہ نہ کر سکی کہ مجھے قلزہ اچھی لگی ہے یا بری۔ لیکن یہ طے تھا کہ وہ میری جگہ لے چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

کلاس کے دوران وہ لیکچر کم ٹوٹ کرتی اور تھکے سوال زیادہ کرتی۔ لیکچر کا زیادہ تر وقت رضا اس کے ہر سوال کا پورے حلق سے جواب دینے میں گزار دیتے۔ وہ انہیں رنج کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ اس کے بعض سوالوں میں کوئی سیس نہ ہوتا تھا۔

”بندر کی دم کیوں ہوتی ہے سر حیات؟“ میں حیرانی سے سوچتی کہ اس بے شک سوال کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔

”کیونکہ بندر کو درخت سے ٹکنا ہوتا ہے۔ سو وہ اپنی دم کو شاخوں پر رول کر کے ٹکاتا ہے۔“ رضا بہت

ماہنامہ پاکیزہ۔ اپریل 2012ء (157)

مہر سے مسکراتے ہوئے ہر بات کی وجہ جانتے تو میں انہیں داد دے بغیر نہ رہ سکتی مگر پھر.....

”بندوں کا درختوں پر ٹکنا کیوں ضروری ہے، وہ ایسے ہی کیوں نہیں رہ سکتے؟“

”اُف.....“ میں دل ہی دل میں کڑھنے لگی تھی۔ قلزہ سے سب ہی اب کوفت کھانے لگے تھے۔ اس کے سوال وقت کا نزیاں تھے اور کچھ نہیں۔ یہ بات سب پر عیاں تھی پھر بھی رضا اسے جواب ضرور دیتے۔ اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ اس روز میں رضا کے آفس کس کام سے گئی تھی شاید کوئی اسائنمنٹ جمع کرانا تھا۔ دروازہ نیم وا دیکھ کر میں نے دھکیلا تو سامنے کا منظر عیاں ہوا۔ قلزہ، رضا کے مقابل کرسی پر بہت بیزاری بیٹھی تھی۔ کہنی میز پر ٹکا کر تھیلی ٹھوڑی تلے بیٹھے، وہ بلند آواز سے کسی بات پر بحث کر رہی تھی۔ آہٹ پر اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور پھر لب بچھ لے۔

”آئیے حلیمہ!“ رضائری سے مسکراتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی قلزہ کی کرسی تک آئی۔ اس کے ساتھ ایک خالی کرسی رکھی تھی۔ رضائری اس خالی کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ ”بیٹھیں۔“ قلزہ ایک دم کھڑی ہوئی، ایک خچھی نگاہ مجھ پر ڈالی اور اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولی۔

”آپ مصروف ہیں تو میں اپنا سوال پھر کلینر کر لوں گی۔“

”ارے نہیں قلزہ، آپ بیٹھیں، میں نے حلیمہ سے چند ایک.....“

”رہنے دیں، جا رہی ہوں میں۔“ ایک کڑی نگاہ مجھ پر ڈالی کہ اس نے میز پر رکھا پرس اٹھایا اور ٹھک ٹھک کرتے ہوئے کمرے سے نکلی پھر اپنے پیچھے

زور سے دروازہ بند کیا۔

”ناجھ ہے، اپنی ہے، تم براست ماننا بیٹھو۔“

”جیس پر وینسر، بس یہ اسائنمنٹ.....“

نے کانڈوں کا پلندہ ان کی طرف بڑھایا۔

”ادکے..... میں دیکھ لیتا ہوں۔ چائے پیو گی پھر کافی؟“

”کچھ نہیں، مجھے ذرا کام سے جانا ہے۔“ مٹا کچھ سے شکست قدموں سے پلٹ گئی۔ میں کیوں نہ اور کس کے لیے۔ مجھے اپنا آپ رضا پر ایک بوجھ لگنے لگا تھا۔ ان کی زندگی کی مکمل تصویر میں میری کہ جگہ نہیں تھی۔ آہستگی سے میں نے ان کے کمر دروازہ بند کیا تو دیکھا قلزہ دیوار سے ٹیک لگا بیٹھے پر بازو لپیٹے کھڑی ہے، میں سر جھکائے آ بڑھنے لگی تو وہ ایک دم میرے ساتھ چل دی۔

”کیا ہے تم میں حلیمہ واؤڈ کا پر تو کسی مگر یہ بات میں وقت تمہاری باتیں ہی کرتے ہیں؟“

میں ٹھنک کر اس کی جانب پلٹی، وہ عجیب تر ہوئی لگا ہوں سے میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”حلیمہ یہ ہے، حلیمہ وہ ہے، انہیں حلیمہ آگے اور پیچھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے لگتا ہے کہ تم ہو، وہ میری طرف کبھی نہیں دیکھیں گے۔“ اس کے لہجے میں اتنا کرب اور دکھ تو میں دنگ رہ گئی۔

”قلزہ! میرا اور تمہارا کیا مقابلہ؟“

”ہے نا! تجھی تو وہ میری ہر شے کو تم سے کرتے ہیں۔ میں کیا کروں کہ میں تم جیسی بین جا حلیمہ؟“ پھر اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے

”مجھے اپنے جیسا بنا دو حلیمہ واؤڈ شاید مجھے ایک نظر دیکھ لیں۔“ مجھے لگا اس کی لانی

میں نمی ہے۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایسی

دگر ب تھا کہ میں یک تک اسے دیکھ گئی۔ زندگی میں پہلی دفعہ وہ مجھے بری نہیں لگی تھی۔

”اچھا! میرے ہاتھ چھوڑ دو لوگ دیکھ رہے ہیں۔ آؤ پیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ میں آگے چل دی اور آخری نازک مزاج، شاہانہ سی لڑکی سر جھکائے میرے پیچھے ہوئی۔

اس ہیرے کو توڑنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ پہلے سے ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کی روح، دل اور احساسات، سب ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے۔ وہ وہ لہجوں تھی جو کلاس میں لگتی تھی۔ وہ رضا کو زچ کرنے کے لیے سوال نہیں کرتی تھی۔ وہ وقت ضائع کرنے کے لیے بخشش نہیں کرتی تھی۔ وہ تو صرف توجہ کی طالب تھی۔ اسے رضا کی توجہ چاہیے تھی۔ اسے صرف ان کی اپنے لیے کئی گئی چند باتیں چاہیے تھیں۔ وہ دینا اور کے روپ میں حلیمہ واؤڈ کا پر تو کسی مگر یہ بات میں سے بتا نہ سکی۔

اس کے والدین آسٹریلیا میں تھے۔ وہ بڑھنے لے لیے پاکستان آئی تھی۔ پڑھنے کے لیے عموماً لوگ ہا تان سے آسٹریلیا جاتے ہیں مگر قلزہ کا ہر کام الٹا ہوتا تھا۔ وہ والدین سے دور رہنے کے لیے ادھر اپنی ماں کے پاس رہنے آئی تھی۔ بڑھائی کا تو بس بہانہ، اس کے پیش کی آپس میں کبھی نہیں بنی تھی اور نہ پلے کا امکان تھا۔ وہ ان کی روز، روز کی بک، بک اپنی مریض بن گئی تھی اور پھر ادھر ارسل تھا۔ اس کا راز، اس کے عشق میں پاگل..... مگر قلزہ کو اس لڑکی کی حد تک کوفت تھی۔ وہ سارا وقت ارسل اور بھائی کی کوشش کرتی مگر اس کی آتش عشق دھڑکتی۔ شادی پر اصرار سے لے کر مودی پہ ساتھ لے تک۔ ارسل ہر بات میں اس کی منت کرتا اور وہ گارتی رہتی۔ اب تو اس کا گھر جانے کا دل ہی نہیں تھا۔ وہ توجہ کی طالب تھی اور من چاہی توجہ اسے

ابلیس

صرف ایک ہی شخص دے سکتا تھا۔ رضا حیات خان.....

”مجھے ہر طرف رضا کا چہرہ نظر آتا ہے۔ ہر دیوار، ہر کھڑکی، ہر درخت پر۔ میں آسمان کو دیکھوں تو بھی وہ نظر آتا ہے۔ ایک دن میں ان کو کہیں میں نہ دیکھوں تو میری سانس بند ہونے لگتی ہے۔ میں کیا کروں حلیمہ؟“ اور مجھے جو لگتا تھا کہ اس مرض عشق میں، میں اکیلی ہی جتا ہوں تو لگتا لگتا تھا کہ وہ بھی میرے جیسی ہی تھی۔

اس روز ہم دونوں دوست بن گئے۔ ایک قطعاً بھدا سا جوڑ..... مگر خیر جوڑ تو بن گیا تھا۔ ہمارے درمیان ایک ہی اشتراکیت تھی اور کیا مجھے بتانے کی ضرورت ہے کہ کیا تھی؟

☆ ☆ ☆

رات کو قلزہ کی کال آئی۔ وہ بری طرح رورہی تھی۔

”ارسل نے کچھ کہا ہے کیا؟“ میں پریشان ہو گئی۔

”بھاذ میں کیا ارسل..... میری زندگی میں ارسل سے زیادہ مسائل ہیں۔“ وہ چلائی تو میں نے گہری سانس لی۔

”پھر.....؟“

”پروفیسر رضا..... وہ میری کال نہیں اٹینڈ کر رہے۔“

”تو رو کیوں رہی ہو؟“

”اگر تمہاری کال اٹینڈ نہیں کریں تو تم روؤ گی نہیں؟“

”نہیں۔“ حالانکہ مجھے پتا تھا کہ میں بھی رددوں کی مگر گھٹ گھٹ کے اس کی طرح بے آواز بلند نہیں۔

”جیہیں ان سے دسی محبت نہیں ہے پھر جیسی

”محبت کے پیمانے اپنی مرضی سے مت
بھرو قلزم۔ تم کسی کے دل کا حال کیا جاؤ۔“
”پر وہ تمہیں مجھ سے زیادہ محبت دیتے ہیں،
زیادہ عزت دیتے ہیں، تمہیں چھوٹی بہن بولتے ہیں
اور میں تو کہیں نہیں ہوں۔“
”بہن بولیں، بیٹی بولیں یا اسٹوڈنٹ۔۔۔ ہم
دونوں کا رشتہ برابر ہے۔“ میں اسے سمجھانے لگی مگر وہ
خندی لڑکی کہاں سمجھتی تھی۔

”پتا ہے حلیمہ۔۔۔ میری ای میرے ابو سے
جب بہت لڑتی تھیں تو انہیں کہتیں کہ سب مرد ایک
جیسے ہوتے ہیں اور جب میں سوچتی شاید واقعی ایسا ہے
مگر اب رضا سے مل کر مجھے لگتا ہے کہ سب مرد ایک
سے نہیں ہوتے۔ کچھ مرد رضا جیسے بھی ہوتے ہیں۔
عورت کو احترام اور عزت دینے والے، لگاؤ ہیں جھکا کر
رکھنے والے، مضبوط کردار کے بچے مرد۔“

”بالکل!“ میرے لبوں پر ایک معصوم
مسکراہٹ کھرمگئی۔ رضا ایسے ہی تھے۔ لگاؤ ہیں جھکا کر
بات کرنے والے، عموماً جب وہ میرے ساتھ مخاطب
ہوتے تو وہ مجھے دیکھ بھی نہیں رہے ہوتے تھے۔

”لیکن پتا نہیں کیوں حلیمہ۔۔۔ میں ان کی بیوی
سے بہت جنٹلس ہوتی ہوں۔ پتا نہیں کیوں۔“ فون
رکھنے سے قبل اس نے کہا تو میں بے اختیار چوکی تھی۔

☆☆☆

بہت دن بعد رضا کا فون آیا تو میں بہت خوش
ہوئی۔

”ہمیں کیسے یاد کر لیا، پروفیسر؟“

”کرتو لیا!“ وہ دھیرے سے ہنسنے۔

”مگر میں سب کیسے ہیں؟“

”اچھے ہیں، تم سناؤ، اچھے کون ہیں میں حصہ
لے رہی ہو؟“

”میں کہاں اچھا بول سکتی ہوں، پروفیسر؟“

”کوشش تو کر سکتی ہو۔“

”جائے دیں بلکہ قلزم کا نام دے دیں نا۔“

”اچھا بول لیتی ہے۔“

”یہ تم دونوں کی دوستی کیسے ہوئی؟“ وہ

حیران ہوئے۔

”بس ہو گئی۔۔۔ آپ کو برا لگا؟“

”نہیں۔۔۔ قلزم ریٹیکلڈ چائلڈ ہے۔ اسے تو

دیا کر دکر۔۔۔“ وہ جیسے لمبے بھر کو جھجکے۔ ”تھوڑے

احتیاط کرنا، قلزم میں بہت ٹینڈنسی ہے۔“ انہوں

قلزم اور چھوڑا چھوڑا تو میں چوکی۔

”کس چیز کی ٹینڈنسی؟“

”بس یونگی۔۔۔“

”تاکس نا۔۔۔؟“

”بس یہی جھوٹ بولنے کی۔۔۔“

”رنگی!“ میں شاکد رہ گئی۔ ”آپ کو کچھ

پتا؟“

”مجھے پتا ہے، اس نے مجھے اپنے کزن

بارے میں بتایا تو۔“

”ارسل؟“

”ہاں، ارسل۔“ وہ دھیرے سے ہنسنے۔

”کیوں؟ ارسل کیا اس کو اس طرح پسند

کرتا جیسے وہ دعویٰ کرتی ہے؟“

”حلیمہ! واؤ، تم بہت سیدھی ہو۔“ انہوں

کھری سانس لی۔ ”تم نے اس کی ارسل والی بات

یقین کر لیا؟“

”کیوں نہ کرتی؟“

”حلیمہ۔۔۔ ارسل کوئی نہیں ہے، قلزم نا

خالہ زاد کزن نہیں ہے۔ اس کی خالہ تو میری ماما

ہے۔“

”کیا۔۔۔؟“ میں سشدر رہ گئی۔

”اس کے اندر باتیں گھڑنے کی بہت گنجائش

ہے، ذرا احتیاط کرنا۔ وہ بس توجہ لینے کے لیے ایسا

کرتی ہے۔“

”اچھا۔“ میں نے فون بند کیا اور سوچ میں

ارپ گئی۔ چند لمحوں بعد ہی فون دوبارہ بجنا۔ میں

ہلکی۔ قلزم کا لنگ۔۔۔

”ہاں قلزم؟“ میں نے فون کان سے لگا دیا۔

”تمہارا تمہارے بڑا تھا، میں نے رضا کو ٹرائی کیا۔

اس کا نمبر بھی بڑی تھا۔ تم لوگ آپس میں بات کر رہے

تھے کیا؟“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے قلزم؟“ باوجود اس

لی شدت پسندی کے مجھے اس کی فکر رہتی تھی۔ اگر اس

نے ارسل کو گھڑا تھا تو ایسا یاد رکھو میں نے گھڑا تھا۔ اگر

ابھوئی تھی تو میں بھی اتنی ہی چھوٹی تھی۔

”فرق یہ پڑتا ہے کہ مجھے کال کرنے کے لیے

اس کے پاس وقت نہیں ہے مگر تمہارے لیے وقت نکل

آتا ہے۔“ وہ حسد کا شکار نہیں تھی، اسے صرف احساس

ہوئی تھا۔

”انہوں نے صرف تقریری مقابلے کا پوچھنے

لے لیے فون۔۔۔“

”دیکھا۔۔۔ دیکھا۔۔۔“ وہ اندازے کی درستی

والی اور کھٹاک سے فون رکھ دیا۔

”چند ساتھیوں کے گھر میں تو پھر اس کی کال آئی۔

”حلیمہ۔۔۔“ وہ رد رہی تھی۔ ”میں پاگل ہونے

لگی ہوں۔“

”خود کو سنبھالو قلزم۔۔۔ وہ تمہارے بچہ ہیں،

دے لیے کتنا کر سکتے ہیں؟“

”بس ایک نظر۔۔۔ ہر دن میں ایک نظر کی تڑپ

لگے۔“ وہ اپنے آپ میں نہیں تھی، اس کی تڑپ

داد تھی۔

سالگرہ کی بہار

بہار آئی گلاب بنے

ہماری آنکھوں کے خواب بنے

سبکی کلیوں کو دکھ کر پھر

محبوبوں کی وہ سوچی خواہش

چمک کے بیدار ہو گئی ہے

نگہوں کے شانے پر سر ٹکا کر

سبا بھی سرشار ہو گئی ہے

وہ بھولے بسرے تمام لمبے

وہ ساتھیوں وہ تمام جذبے

جو وقت کی دھول میں اٹ گئے تھے

خواب نے اندر سمٹ گئے تھے

وہ لے کے انگڑائیاں جی اٹھے ہیں

ہماری آنکھوں میں جھانکتے ہیں

اے کاش! دل کی دیریں زمیں پر

بھیتوں کی بہوار پر سے

برستی برکھا کہاں مقدر

وہ بوند ہی تیرا بہار ہے

تو دیکھنا پھر کہ جان جاناں

ہماری آنکھوں کے ٹھنڈاتے

چراغ یوں لودے اٹھیں گے

کہ چاند تارے مدھم لگیں گے

داہوں کے طعنے یوں کھل اٹھیں گے

کہ پھول بھی مسکرائے اپنی

قہاؤں کو پھر سیٹ لیں گے

شاعرہ قاطرہ نجیب، کراچی

”تم ان کے بارے میں دوسرے طریقے سے

مت سوچو۔“

”نہیں سوچتی۔۔۔ اور وہ ایسے بندے ہیں بھی

نہیں۔ وہ تو نظر بھر کر بھی مجھے نہیں دیکھتے۔ کوئی مرد اتنا

مست سوچو۔“

”نہیں سوچتی۔۔۔ اور وہ ایسے بندے ہیں بھی

نہیں۔ وہ تو نظر بھر کر بھی مجھے نہیں دیکھتے۔ کوئی مرد اتنا

”ہاں ہے حلیمہ، اس روز میں ان کے آفس گئی تو وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ میں زمین پر بیٹھ گئی اور ان کو نماز پڑھتے دیکھتی رہی۔ وہ سجدے میں جبکہ گئے تو میں سانس روک کے ان کے اٹھنے کا انتظار کیے گئی۔ ان کی نماز اتنی آہستہ، دھیمی اور خوب صورت تھی کہ میں بتا نہیں سکتی۔“

”سوتو ہے۔“ اور پھر ہم دونوں گھنٹوں رضا کی باتیں کیا کرتے۔ ہمارے پاس گفتگو کے لائق کوئی اور موضوع رہا ہی نہیں تھا۔ ہمارے واحد بونٹنے ہمیں ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا اور پھر میں اور قلزمہ الگ ہوئی نہ سکے۔

☆☆☆
مجھے شدید ٹائیفائیڈ نے آن گھیرا اور میں کئی دن تک بستر پر رہی۔ دوائیوں کا ایک ڈھیر تپائی پر دھرا رہتا اور میں نیم بے ہوشی کی حالت سے کبھی نکل پاتی اور کبھی نہیں۔

شاید مجھے یونیورسٹی سے مانگ کیے چھٹا روز تھا
جب فلزہ مجھے دیکھنے آئی۔

”دیکھو تو میرے ساتھ کون ہے؟“ اس کی آواز میں خوشی کی رعت تھی۔ میں نے بہ وقت آنکھیں کھولیں تو دیکھا رضا جیات چوکٹ میں کھڑے تھے۔

”پروفیسر!“ میرے لب پھڑپھڑائے، آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

”اب رضا آئے ہیں نا تمہیں دیکھنے، اب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ وہ بے تکلفی سے کہتی پھرے سر ہانے آٹھنٹھ پھر رضا کے لیے ساتھ ہی کرسی چلتی۔

”آئیں رضا، بیٹھیں نا۔“ وہ اسی طرح ان کو نام سے پکارتی تھی۔

162 ماہنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء

”کیسی ہیں آپ حلیمہ داد؟ ہم سب کو پریشان عیا کر دیا۔“ وہ میرے قریب کر رہی بیٹھے۔ دیکھ لے جس کہہ رہے تھے۔

”بس! میرا گلہ رندہ گیا۔ میں لیٹی ہی رہی
اٹھنے کی سعی بھی نہیں کی۔“

”اللہ آپ کو صحت دے گا۔ یہ بیماری کچھ نڈ
سوائے اس کے کہ یہ پاک کرنے والی ہے۔“
”تھینک یو پرو فیسر۔“ میری آواز بھیگی ہو
تھی۔

”رضا۔۔۔ آپ تو اسنے نیک ہیں، اب عبادت گزار ہیں، کچھ پڑھ کر پھونکیں، نا حلیمہ پر کہ نیک ہو جائے۔“

”اتنا بھی نیک نہیں۔“ وہ جھینپ گئے۔
 ”ہیں نا۔۔۔ حلیمہ تمہیں پتا ہے رضا چھ سال

عمر سے تھہر پڑا رہے ہیں اور آج تک ان کی کوئی تہ نہیں چھوئی۔“

”جانے دو قلندر“ وہ شرمندہ ہو گئے اور میں سوچنے لگی کہ جس شخص کی ستائیس سال تک کوئی تہجد رہی ہو، اس کا مقام اللہ کے نزدیک کیا ہوگا؟ میرا رعب سے بھرنے لگا۔

پھر وہ اٹھے اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر ہو
سے کوئی آیت پڑھنے لگے۔ انا کا عربی لہجہ بہت نہ
صورت تھا۔ چند لمحے بعد وہ خاموش ہوئے اور اٹھ
ہٹا دیا۔

”اب تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“ جاتے ہوئے
نے بس اتنا ہی کہا تھا۔

رات تک وہ نائی فاسڈ جو پہلے اترنے کا نام لے رہا تھا، یوں غائب ہوا جیسے کبھی جڑھا ہی نہ تھا۔
گلی صبح میں ہشاش بشاش کی کمپس میں تھی۔۔۔ مگر
حیران نہیں تھی۔

جس شخص نے ستائیس سال اللہ کی عبادت

ہو۔ اللہ اس کی بات کیوں مانتا حلیمہ؟ اور میں اس سے متفق تھی۔

☆☆☆
ان دنوں قلزہ بہت خوش رہنے لگی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک چمک اور الوہی منکراہٹ ہمہ وقت رہتی۔ اب وہ رضا کو زوج کرنے والے سوال بھی نہیں کرتی تھی بلکہ ہر دم میرے ساتھ رضا کی باتیں کرتی۔ ان کو کھانے میں یہ پسند ہے، ان کو پرندوں کی یہ برائے اچھی لگتی ہے، ان کا پسندیدہ لباس یہ ہے، وہ قرآن کے حافظ ہے اور ہر وہ بات جو میں نہیں جانتی تھی قلزہ کو معلوم ہوتی تھی۔ رضا کے بارے میں وہ مجھ سے کچھ غلط نہیں کہتی تھی۔ گوکہ ارسل کے قصے اب بھی اس کی زبان پہ ہوتے لیکن اب وہ بہت کم ہی وہ قصے سناتی۔ رضا اس کی ہر بات کا آغاز و اختتام ہوتے تھے۔

شاید رضا اس کی ذہنی حالت اور دیوانگی مہری طبیعت کو سمجھ چکے تھے۔ تبھی اس کو تو یادہ وقت دینے لگے۔ وہ اکثر کلاس آف ہونے کے بعد بھی کھٹنوں رضا کے آفس میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ فلزہ کمر لیت جانے لگی تھی اور جب کمر جاتی تو بھی رضا کو فون پر معروف رکھتی۔ پڑھائی پر سے اس کی توجہ ہٹ چکی تھی۔ وہ نہ امتحان قریب ہونے پر و حیان دیتی، نہ اساتذہ پر وہ تو اب لیکچرنوٹ کرنے کا کٹھن بھی نہ کرتی تھی۔ رضا کی کلاس میں قلم ہونٹوں میں دبائے آئیل پر رضوی دکائے ایک بک رضا کو دیکھے جاتی۔ دوسری کلاسز تک کر دیتی۔

پہلے میں ہفتے میں ایک بار رضا کے آفس چلے
جایا کرتی تھی کوئی موضوع سمجھتا ہوتا یا ایسے ہی دل
ہماری ہو جاتا تو ان سے بات کر کے اچھا لگتا تھا۔ مگر
جب سے وہ فلزہ کو زیادہ وقت دینے لگے، میرے لیے
وقت کا خزانہ تنک ہو گیا۔ یہاں تک کہ کلاس میں لکچر

کے علاوہ مہینہ گزر جاتا اور میں شاید ہی ان کی فصل دیکھ پاتی۔

میں نے بھی پھر انہیں آزاد چھوڑ دیا۔ استاد اور شاگرد کا رشتہ اس سے آگے کہاں جا سکتا تھا بھلا؟ مجھے یہ بات سمجھ آ گئی تھی۔ مگر پھر بھی اپنے ہر مسئلے کے حل کے لیے میں ان کی طرف دیکھتی۔ میرے دل میں ایک امید جاگ اٹھی تھی کہ اگر درشا میرے لیے دعا کریں تو میری مفلوج ٹانگ ٹھیک ہو سکتی ہے۔ چھوٹے شرارتی بچوں کی طرح بھاگنے اور دوڑنے کو میرا دل چاہنے لگا تھا۔

مگر ایک اذیت بھی تھی۔ عشق لا حاصل.....
 کدھر لے جائے گا یہ عشق لا حاصل مجھے؟ میری روح
 جھٹکنے لگی تھی۔ میں رضا کی محبت میں قلندر کی طرح ڈوب
 چکی تھی مگر اس کا انجام کار کیا تھا؟ اس دور کی آخری
 لکیر کدھر تھی؟ لیکن اپنے بارے میں اب میں کہاں
 سوچتی تھی۔ میں تو قلندر اور رضا کی قلم کی خاموش
 تماشا بن چکی تھی۔

☆ ☆ ☆
چند نئے مزید گزریں تو مجھے قلزم میں ذرا فرق محسوس ہوا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ کھوکی کھوکی رہنے لگی تھی۔ میں اس سے مخاطب ہوتی تو وہ پکارے جانے پر بری طرح چونک جاتی۔ کبھی ذرا جاتی۔ بات بے بات رونے لگ جاتی۔ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر بہنے کو تیار ہوتے۔

”فلزہ، تمہیں کیا ہوا ہے؟“
 ”ہوں، کچھ نہیں، کچھ نہیں.....“ وہ پھیکا سا
 مسکرا کر کہتی تو میں مطمئن نہ ہوتی۔

”کوئی مسئلہ ہے قلزم؟“
”نہیں۔۔۔“ اس کی رنگت اب زرد رہنے لگی
تھی۔ میں بہت لمبی چستی بکروہ بھاپا جاتی۔

پھر ایک روز وہ ہوا جو مجھے ساری زندگی الیت
ماہنامہ ہائیکوڈہ — اپریل 2012ء (169)

دیتا رہے گا۔ میں جو قلمزہ کے لاکھ چھپانے پر بھی کر پد میں لگی رہی۔ ایک روز سب کچھ ایک دم سے جان لگی اور وہ میری زندگی کا بدترین دن تھا۔

☆☆☆

”پر فیضر رضا کہتے ہیں کہ میں ان کی چھوٹی بہنوں کی طرح ہوں حلیمہ۔۔۔۔۔ کتنا معتبر کر دیتا ہے یہ رشتہ آپ کو۔ اب میں انہیں رضا بھائی بلانے لگی ہوں۔ وہ خالی رضا بلانے پر ٹوکتے ہیں۔“ ہم دونوں لاہریری کے باہر میز میوں پر بیٹھے تھے۔ جب وہ از خود بتانے لگی۔ ہمارے درمیان اس موضوع کے علاوہ کسی دوسرے پر کبھی بات ہی نہیں ہوتی تھی۔

”یہ تو اچھی بات ہے۔“

”مگر میں ان کی بیوی سے بہت جلیس ہوتی ہوں حلیمہ۔“

”ایسا مت سوچو رضا کے بارے میں، تمام مرد ایک سے نہیں ہوتے۔“

”وہ تو مجھے بتا ہے اور رضا بھائی جیسا تو کوئی نہیں ہے۔ جس شخص نے ستائیں برس تک اللہ کی عبادت کی ہو اس کو تو سب معاف ہے نا؟“

”ہاں! نہیں، پتا نہیں۔“ میں نے نا بھگی میں سر ہلایا۔ مجھے اس کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

”اجما چلو، کینٹین چلتے ہیں۔“ وہ فائل اٹھا کر کھڑی ہوئی تو ایک چھوٹا سا تہ شدہ کاغذ اس کی فائل سے گرا اور میرے قدموں میں آن پھرا۔

وہ اپنی دھن میں آگے بڑھ گئی۔ ویسے بھی وہ ذرا غائب دماغ رہنے لگی تھی۔ آگے پیچھے کا ہوش اسے نہیں رہتا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ اٹھایا اور اسے پکارا۔

”قلمزہ! مگر وہ دور نکل چکی تھی۔

میں نے کاغذ کی جھلیں کھولیں شاید اس کا کوئی

اسائنمنٹ ہو جس میں جمع کرا دوں گی لیکن سوچ کر میں نے وہ کاغذ کھولا تھا۔

وہ ایک پرغز کاغذ تھا۔ میں اسے پڑھتی گئی، بار بار پڑھتی گئی یہاں کہ میرے وجود سے جان نکل گئی۔ میری آنکھوں کے آگے اندر میرا چھانے کا لیکن پھر میں نے ہمت مجتمع کی اور کاغذ اپنے بگ میں رکھ کر اٹھی۔

”قلمزہ۔“ میں نے اسے جالیا۔ ”کینٹین نہیں، لاہریری چلو۔“

”کیوں؟“ وہ کسی خیال سے چوکی۔

”چلو نا۔۔۔۔۔“ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے زبردستی لاہریری کی طرف لے آئی۔

اندر سناٹا چھایا تھا۔ ہم دونوں کتابوں کے ایک ریک کے پاس جا کھڑے ہوئے اور مجھے پتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے کونے میں رکھی ایک کتاب اٹھائی اور قلمزہ کی طرف مڑی۔

”ایک بات پوچھوں؟“ جج جی بتانا۔“ میں نے بائیں ہاتھ میں اس کا موسیٰ ہاتھ تختی سے جکڑ لیا تھا کہ وہ بھاگنے نہ پائے۔

”ہاں بولو۔“ وہ خیر ان ہی کھڑی تھی۔

”یہ بچہ کس کا ہے؟“

”کیا؟“ اس نے الجھ کر مجھے دیکھا۔

”تم کس کے بچے کو جنم دینے والی ہو؟ تمہاری پرنسپل سی رپورٹس پاز میو آئی ہیں۔“

”نہیں!“ اس کا رنگ لٹھے کے مانند سفید پڑ گیا۔ بے اختیار اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکالنا چاہا مگر میں نے گرفت اور مضبوط کر دی۔

”بولو۔۔۔۔۔ یہ بچہ کس کا ہے؟“ میں سرخ آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ اس کا رنگ خیر چکا تھا۔ وہ بے جان لاش بنی پھرائی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی۔

”نام بتاؤ مجھے اس کا۔ کون ہے وہ؟“

وہ بار بار لب کھولتی۔۔۔۔۔ پھر بند کر لیتی۔

”قلمزہ۔۔۔۔۔ جواب دو۔“ میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

”ار۔۔۔۔۔ ارسل کا!“ یہ مشکل وہ بول پائی۔

”جھوٹ! تمہارا ارسل نام کا کوئی نگران نہیں ہے۔“

”نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کی سعی کرنے لگی۔

”یہ قرآن ہے، اس پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ یہ بچہ کس کا ہے، کس کے ساتھ کیا ہے تم نے گناہ۔“ میں نے اس کا ہاتھ زبردستی اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتاب پر رکھا تو وہ ایک دم وحشت زدہ سی ہو کر تڑپنے لگی۔ وہ محض ایک عام سی کتاب تھی مگر قلمزہ اسے قرآن سمجھ کر لرز اٹھی تھی۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔“ وہ خود کو چھڑانا چاہتی تھی مگر چھڑا نہیں پاری تھی۔

”نام بتاؤ قلمزہ۔۔۔۔۔ بس نام۔“ وہ رونے لگ گئی۔ میری جنتیں کرنے لگی کہ میں اسے چھوڑ دوں مگر جب میری گرفت سے خود کو نہ چھڑا سکی تو ایک دم اس کے لبوں سے کھلی کھلی چیخ نکلی۔

”میں نے جان بوجھ کر نہیں۔۔۔۔۔ اس نے مجھے مجبور کیا۔۔۔۔۔ زبردستی۔۔۔۔۔“

”کون ہے وہ؟“ اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں اس کا جواب جانتی تھی۔

”رضا۔۔۔۔۔ رضا حیات۔۔۔۔۔ خان۔“ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ بے دم سی پیچھے دیوار سے جا لگی اور وحشت سے پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ شاید خود بے یقین تھی۔

میری جیسا کھی زمین پر گر گئی۔ میں خود بھی آہستہ سے فرش پر آٹھنی اور پھر دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھے

رونے لگی۔ میرا سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ میرا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ میرا پارس پتھر جل کر کوئلہ بن چکا تھا۔

لوگ میرے ارد گرد اکٹھے ہونے لگے اور میں روتی گئی، کوئی وجہ پوچھتا اور کوئی تسلی دیتا۔ سب حیران پریشان تھے کہ یہ بد صورت تشکری لڑکی یوں زمین پر بیٹھی کیوں روتی ہے۔

”شاید اس کا کوئی مر گیا ہے۔“ کسی نے ہمدردی سے تبصرہ کیا۔ بات ٹھیک تھی میرا عزا زل مر گیا تھا۔ میں یونہی بلک بلک کر بچوں کی طرح روتی رہی۔ یہاں تک کہ لوگوں کا جھوم چھٹا گیا اور میں لاہریری میں تنہا رہ گئی۔ تب میں اٹھی اور وہ کتاب اٹھائی اور اپنی۔ بیساکھی کے سہارے خود کو کھینچتی باہر جانے لگی۔

گھر تک کا سفر اس روز بہت طویل، بہت کٹھن لگ رہا تھا۔ میں آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے سامنے دیکھتی، بے خودی چلتی جا رہی تھی۔ وہ ساحر تھا۔۔۔۔۔ اس کے ایک اشارے پر بل کھاتی رسیاں سانپوں کی طرح دکھتی تھیں۔ مگر سحر اور جھوٹے میں یہی تو فرق ہوتا ہے، سحر سے رسیاں سانپوں کے مانند دوڑتی ہوئی لگتی ہیں مگر سانپ بن نہیں جاتیں۔ جلد یا بدیر جاوہ کا اثر ڈائل ہو جاتا ہے اور جھوٹا عصا کو واقعی اڑوایا دیا کرتا ہے۔ ایسا فرقان عطا کرتا ہے کہ ہر شے اگل اگل ہو جاتی ہے جیسے سمندر میں اکٹھا ہوتا کڑوا اور میٹھا پانی جو کبھی ایک دوسرے میں داخل نہیں ہو پاتا۔

میں اند میرے میں ڈوبتے فٹ ہاتھ پر چلتی جا رہی تھی۔ میری بیساکھی کی تک تک مغرب کی اذانوں میں کم اور رہی تھی۔

کتنا حرم ہوا میں نے ہر مسئلے کے حل کے لیے رضا کا چہرہ دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ میں بھی تھی مجھے ان سے عشق ہے مگر نہیں۔۔۔۔۔ میں نے تو انہیں اپنا خدا۔۔۔۔۔

مجازی خدا بنالیا تھا۔ صدیوں پہلے جب
نیل کا دریا پار کر کے اسرائیل کی اولاد
ایک بستی پر سے گزری تھی تو ان کا خلف لوگوں نے بستی
والوں کے جھوٹے معبودوں کی عبادت دیکھ کر موٹی
سے کہا تھا کہ ہمیں بھی ایک ایسا الہ (معبود) بنادو۔
میں نے بھی سبکی کیا تھا جب رضا حیات کو دیکھا تو دل
نے خواہش کی کہ میں بھی اس پر فخر اور ہوسکوں۔
پھر جب موسیٰ کو وہ طور سے نہ لوٹے اور بنی اسرائیل پہ
مدت لمبی ہو گئی تو انہوں نے کہا کہ موسیٰ کا الہ اس سے
مکم ہو چکا ہے۔ مجھ پر بھی مدت لمبی ہو گئی تھی۔ میں
نے بھی لاشعوری طور پر یہ سمجھا تھا کہ میری مدد کرنے
والا میرا الہ مجھ سے کھو گیا ہے اور پھر میں نے ہنجر
بنالیا، جیسے بنی اسرائیل نے بنالیا۔ ایک سونے کا چمکتا،
دھمکتا، بے حد خوب صورت ہنجر۔

مجھے اس کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا، میں
نہیں جانتی مگر میرا حساب شروع ہو چکا تھا، کوئی
میرے اندر بار بار مجھ سے پوچھتا رہا تھا کہ کہاں ہے
تمہارا وہ مددگار مجازی خدا؟ پکارو رضا حیات کو۔ وہ
آئے اور تمہیں اس اذیت سے لگا لے جس میں فلزہ
کے اعتراف نے تمہیں دھکیل دیا ہے۔

میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی
مگر وہ چہرے جو ہر مصیبت کی گھڑی میں میرا مشکل
کشما بن کر سامنے آتا تھا۔ آج مجھ سے کم ہو چکا تھا۔
میرا عزرا زیل، ایلیم بن گیا تھا۔

☆☆☆

”میرا قصور نہیں تھا۔۔۔ انہوں نے مجھے مجبور
کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمارا یہ تعلق مذہب اور
معاشرے کی پابندیوں سے ماوراء ہے۔“ وہ درخت
سے ٹیک لگائے آنسوؤں سے ہیکے چہرے کے ساتھ
کہہ رہی تھی۔ انہوں نے مجھے مطمئن کیا اور میں مطمئن
ہو گئی۔ تم جانتی ہو وہ گفتگوں کے ساجر ہیں۔ ان کو انکار

166 ماہنامہ پاکیزہ — اپریل 2012ء

کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔“

میں دیران لگا ہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ فلزہ
کا چہرہ بیماری کی حد تک زرد پڑ چکا تھا۔ آنکھوں تلے
حلقے اور گالوں میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ وہ اتنی کمزور
اور اجڑی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر پہلی نظر میں بتایا
جاسکتا تھا کہ وہ زندہ لاش بن چکی ہے۔

”علیمہ! میں انہیں کہتی ہوں کہ وہ مجھ سے شادی
کر لیں مگر وہ نہیں کرتے۔ وہ ہر دفعہ شادی کی بات
ٹال دیتے ہیں۔ وہ بات اوہرا اوہرا گھما دیتے ہیں۔ کیا
وہ مجھ سے شادی کر لیں گے؟“

”شاید نہیں۔۔۔ ایک پریکٹ فمیلی کے ہوتے
ہوئے وہ کیوں یہ رسک لیں گے جبکہ انہیں بغیر شادی
کے بھی سب مل رہا ہے۔“

”علیمہ!“ اس نے تڑپ کر مجھے دیکھا۔ ”جب
سے میری رپورٹس آئی ہیں میں ان سے نہیں ملی۔ بس
فون پر ہی زور دیتی ہوں شادی پر۔“

”اور اب تم ان سے ملو گی بھی نہیں۔ سنا تم
نے؟“ میرے سختی سے کہنے پر اس نے اثبات میں سر
ہلا دیا۔

چند روز گزرے اور اس نے اپنی خالہ کا گھر
چھوڑ دیا۔ وہ میرے گھر آ کر رہنے لگی۔ اماں کو
اعتراض ہوا مگر میں نے انہیں منالیا کہ شوہر نے طلاق
دے دی ہے، وہ بے جاری کدھر جائے؟ اور جب
اماں کو میری زبانی علم ہوا کہ ماسوں کو کرائے کی رقم
دینے والی فلزہ ہی تھی تو ان کے سارے اعتراض اور
ٹھٹھوک و شبہات دور ہو گئے۔

میرا ہیرا نوٹ چکا تھا اور میں ہر امید نہیں تھی کہ
وہ دوبارہ بھی جڑ بھی پائے گا یا نہیں۔

زرد چہرہ اور ٹھٹھا والے وہ یا تو بستر پر
پڑی غلاڑیوں میں گھورتی رہتی یا پھر بے آواز آنسوؤں
سے روتی رہتی۔ زندگی فلزہ کے لیے ختم ہو چکی تھی

رضا اب اس کی کال بھی اٹینڈ نہیں کرتے تھے۔ وہ ان کی آواز سننے کو ٹرپ گئی تھی۔ سر رہی تھی مگر وہ بہت مصروف تھے۔ آج کل وہ ایک مانیٹریشن کر دے کے آنے والی لڑکی ردا قاسم کے ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ مگر اتنے نیک، شریف اور پارسا پروفیسر کے ساتھ ظاہر ہے ردا قاسم صرف اس لیے دیکھی جاتی تھی کیونکہ وہ اسے آنے والے ڈی بیٹ کونسلین کی تیاری کروا رہے تھے اور اسی لیے اکثر جب ردا ان کے آفس میں ہوتی تو دروازہ اندر سے لاکھڑا تھا۔

”میں جانتی ہوں وہ لڑکیوں کو اپنے آفس میں گھیر کر کیا کرتے ہیں۔“ قلزہ درد سے رو پڑتی تھی۔ ”میں سب جانتی ہوں مگر میری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔“ وہ یونہی بگلتی رہتی اور میں خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے جاتی۔ دنیا صرف اس کی نہیں لٹی تھی۔

☆☆☆

”سرہم نے سنا ہے کہ آپ قرآن بہت اچھا پڑھتے ہیں۔ پلیز ہمیں بھی سنائیے۔“ ردا قاسم ہمیشہ کی طرح چمک رہی تھی اور رضا جو کتاب کھول کر پچھلے شروع کرنے ہی والے تھے ذرا سا جھپٹ گئے۔

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔“

”پلیز سر۔۔۔“

”پلیز پروفیسر سنا دیں!“

”سر رضا پلیز۔“

بہت ساری منٹ بھری آوازیں گونجیں اور لڑکیوں نے وہ پنوں سے سر ڈھکنا شروع کر دیا تو وہ گہری سانس لے کر ٹانگ کے قریب ہوئے۔

میں بتا چک تھیں، ویران ٹکا ہوں سے ان کا ہینڈسم چہرہ دیکھ رہی تھی۔ کوئی طال، کوئی شرمندگی، کوئی احساس گناہ، کیا کچھ بھی تھا اور؟ وہ ذرا سا

کھنگھار کر تیبہ پڑھنے لگے۔

ان کی خوب صورت آواز کا بحر پورے ماحول پر چھانے لگا۔ بہت سی لڑکیوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ ہر شخص اس سال میں بندھ گیا تھا سوائے میرے۔۔۔ میں بہت غور سے ان کا چہرہ کھوج رہی تھی۔ کہیں کوئی احساس گناہ رقم تھا یا نہیں؟ یا کیا واقعی انسان کے اعمال اس کی پیشانی پر نہیں لکھے جاتے؟ وہ اتنے ہی پُر سکون، نیک اور پارسا لگ رہے تھے جتنا پہلے لگتے تھے۔ یہی تو فرق ہے بحر اور مجھ سے میں۔ بحر صرف آنکھوں کا دھوکا ہوتا ہے اور میری آنکھیں اب دھوکے کی عادی ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

قلزہ! مجھ کو میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ”اگر وہ میری منتوں ترلوں کے باوجود مجھ سے شادی پر راضی نہیں ہوئے تو اس طرح کیسے ہوں گے؟“

”تم کوشش تو کرو۔ تم خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ کبھی جا کر تم ان کی بیوی کو سب کچھ بتا دو گی۔“ ”میں تو غصے میں کہتی تھی۔ بھلا ان کی بیوی میرا یقین کیوں کریں گی؟“ وہ میری تجویز پر حیران تھی۔ ان کی بیوی تمہارا یقین کیوں نہیں کرے گی؟ یہ شک بھی رضا نے ڈالا ہے تمہارے ذہن میں۔ تم پر اعتماد ہو کر ان سے بات کرو۔ وہ اس دھمکی پر ضرور ڈریں گے۔“ اسے شش دہانچ میں جھلا دیکھ کر میں اسے سمجھانے لگی۔ بہت دیر بعد اسے میری بات سمجھ میں آئی۔

”تمہارے خیر سے کال اٹینڈ نہیں کر رہے تو تم میرے پی ٹی سی ایل سے کال کرو۔“ فون کا ریسیور کریڈل سے اٹھا کر میں نے اس کے ہاتھ میں چھپایا اور اسے الجھتا پھوڑ کر باہر چلی آئی۔

اماں گھر پر نہیں تھیں۔ میں براہِ آمد سے میں تنہا بیٹھ

مگی۔ سامنے میز پر ایکٹیشن دھرا تھا۔ چند لمحے میں سوچتی رہی پھر آہستہ سے ریسیور اٹھالیا۔ میرے اندر موجود رضا حیات کی محبت میں ڈوبی لڑکی مسلسل قلزہ کو جھونکا کہہ رہی تھی۔ شک کے باعث مجھ سے رہانہ گیا اور میں نے سماعت ان کی گفتگو کی طرف لگا دی۔ غیر اخلاقی حرکت تو تھی مگر شاید اس سے کوئی فائدہ ہو جائے۔ وہ کہہ رہے تھے۔

”کس نمبر سے کال کر رہی ہو قلزہ۔“

”حلیہ کے لینڈ لائن سے۔ میں آج کل اس کے پاس رہنے لگی ہوں۔“ وہ چند لمحے کو خاموش ہو گئے۔

”رضا! مجھ سے شادی کر لیں۔ ورنہ میں برباد ہو جاؤں گی۔“ (تم برباد ہو چکی ہو قلزہ) میں نے دل میں سوچا تھا۔

”قلزہ! کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

”آپ مجھ سے شادی کر لیں۔“ وہ میری ہدایت کے مطابق کہہ رہی تھی۔

”ساری زندگی پڑی ہے شادی کے لیے۔ ابھی کوئی اور بات کرو۔“

”ٹھیک ہے اگر آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گے تو میں آپ کی وائف کو سب کچھ بتا دوں گی، یہ بھی کہ میں آپ کے بچے کی۔۔۔“

”تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔“ وہ تجزی سے بولے۔

”پھر مجھ سے شادی کر لیں۔“ وہ اصرار کر رہی تھی۔

رضا چند لمحے کچھ سوچے رہے پھر دھیرے سے بولے۔

”تم نے حلیہ کو تو کچھ نہیں بتایا؟“

”بے فکر ہیں۔ آپ کے اس ڈارک سیکرٹ سے کوئی واقف نہیں۔“ وہ سچی سے بولی۔

ابلیس

”ٹھیک ہے، ہم کل شادی کر رہے ہیں، کل رات آٹھ بجے تم پلیو ایر یا پہنچ جاؤ۔ وہاں سرسٹریٹر کے شور و غم کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑی ہو جانا، میں تمہیں وہاں سے پک کر لوں گا۔ وہاں سے ہم میرے دوست کے گھر چلیں گے جہاں نکاح ہوگا، ٹھیک؟“

”جی۔۔۔ جی۔۔۔“ وہ ٹنگ سی ہو گئی۔

”لیکن اگر تم نے حلیہ سمیت کسی کو بھی بتایا کہ کل رات تم مجھ سے ملنے آؤ گی تو شادی تو چھوڑ دو، میں تم سے بات بھی نہیں کروں گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے آہستہ سے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ دس منٹ بعد جب میں واپس کمرے میں آئی تو قلزہ کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ ”وہ مجھ سے شادی کر لے گا۔“

”سب؟“

”کچھ دن تک!“ وہ مسکرا کر ہال مٹی اور میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ آج بھی رضا حیات کی داسی تھی۔ ان کے حکم پر آنکھیں بند کر کے عمل کرنے والی ان کے فرمان کے مطابق مجھ سے جھوٹ بولنے والی۔

☆☆☆

”مجھے خالہ کی طرف چھوڑ دینا، میرے پیڑش آ رہے ہیں۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔“

اگلی شام جب میں نے اسے دانستہ بتایا کہ میں ماسوں کی طرف جا رہی ہوں تو وہ فوڈ ایڈیٹر پھر تیار ہونے لگی۔

پچھلے گھانا رنگ کی شلوار قمیص کے اوپر اس نے گھالی شغون کا دور پٹا پھیلا کر لے لیا تھا۔ بال کھول کر دائیں شانے پر آگے کوڑا لے لیا اور آنکھوں کو کاجل سے دھنکایا۔ کالوں میں ننھے ننھے ٹاپس پہنے وہ بہت پیاری لگد ہی تھی۔

میں نے جیسی میں اسے اس کی خالہ کے گھر کے

”تم جاؤ، میں آگے خود چلی جاؤں گی۔“ وہ اتر کر بولی تو میں نے سر ہلا دیا پھر میری ہدایت کے مطابق نیکی والا ایک راؤنڈ لے کر واپس ادھر آیا تو قلعہ دور ایک اور نیکی میں بیٹھ رہی تھی۔ میں نے پانچ سو کا نوٹ نکال کر نیکی والے کی طرف بڑھایا۔

”اس لڑکی کا چھپنا کرو۔ یہ بلیو ایریا جاری ہے۔“ کافی فاصلے سے اس کے تعاقب کے بعد میں فرینکو بیکری کے سامنے کھڑی تھی۔ جہاں میں تھی وہاں اندھیرا تھا۔ قلعہ مجھ سے دور مرسل پریز کے شو روم کے سامنے خطر کھڑی آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی مگر میں اسے بنور دیکھ رہی تھی۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑی دیکھی آٹھ بج کر ایک صبح تھا اور بھی مین نے دور سے آتی کار کی ہیڈ لائٹس دیکھیں۔ وہ کار مخالف سمت سے بہت تیزی سے آرہی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس آخری حد تک روشن تھیں۔ اس کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔ ”قلعہ!“ میرے لب پھڑپھڑائے، بے اختیار میں نے دل پر ہاتھ رکھا۔

تیز رفتار کار رزن سے قلعہ کے قریب آئی۔ قلعہ اور میں نے ایک ساتھ ڈرائیو کا چہرہ دیکھا تھا اور وہ چہرہ دیکھ کر قلعہ کی آنکھوں کی جوت جل اُٹی تھی۔ وہ بے اختیار چند قدم آگے سڑک پر آئی۔

”نہیں..... قلعہ.....“ میں چیخا چاہتی تھی مگر میری آواز طلق میں دم توڑ گئی۔ قلعہ اسی طرح سڑک پر آ کے بڑھ رہی تھی۔ تیز رفتار کار قریب آؤتی ہوئی مین سامنے آئی اور قلعہ کو ایک ذرہ دیر مگر مار کر آگے بڑھ گئی۔

ایک دل خراش چیخ کے ساتھ قلعہ لہرا کر پیچے گری۔ میں نے چلا تے ہوئے بھاگنا چاہا مگر بیسائی

گرمی۔ میں خود اوندھے منہ زمین پر جا گری۔

دور قلعہ خون میں لت پت گرمی وحشتانہ انداز میں چلا رہی تھی اس کے ارد گرد لوگ اکٹھے ہونے لگے تھے۔ یہ مشکل اپنی بیسائی، سنبھال کر میں لنگڑا تے ہوئے اس تک پہنچ پائی لوگوں کے جھوم میں سے یہ وقت راستہ بنا کر میں نے دیکھا۔

اس کی آنکھیں کلی تھیں۔ اس کا بے دم وجود خون میں تہلیا تھا اور اس کی نگاہیں بے یقینی سے پھلی ہوئی تھیں۔ نگر کرنے سے زیادہ وہ شاید اس آخری لمحے رضا حیات کے چہرے پر چھائی سفاکی کو دیکھ کر بے یقین ہوئی تھی۔

دور ایبیلیٹس کا سائرن بجتے لگا۔ مگر میں جانتی تھی کہ اب دیر ہو چکی تھی۔ میرا ہیرا پختا چور ہو چکا تھا۔

☆☆☆

قلعہ گرمی اور اپنے پیچھے بہت سے آنسو چھوڑ گئی۔ رضا حیات کو اس کی موت کا کلاس میں پتا چلا تھا۔ وہ بے حد حیران اور ششدر رہ گئے تھے۔ انہوں نے وہیں دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور قرآن کی تلاوت کے بعد ایک رقت آمیز دعا کروائی۔ آخر میں ان کی اپنی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پھر قلعہ کی موت کے تیسرے روز انہوں نے قلعہ کی یاد میں ایک پروگرام کا اہتمام کیا۔ اس پروگرام میں قلعہ کی ایک خوب صورت تصویر پیچھے اٹک پر آؤ بڑاں کی گئی اور قلعہ کے تمام جانے والوں نے اس کے متعلق تاثرات بیان کیے۔

جب مجھے بلایا تو میں نے ایک دیران نگاہ سب پر ڈال کر بس اتنا کہا۔

”قلعہ وہ ہیرا تھی جسے جوہری تراش نہ سکا۔ جوہری نے انکی ضرب لگائی کہ وہ ٹوٹ کر پختا چور ہو گیا۔ ہیرا سب سے سخت کوئلہ ہوتا ہے۔ اگر ٹوٹ

جائے تو جڑ نہیں سکتا۔ وہ بھی ٹوٹ گئی تھی۔“

چند روز گزرے تھے کہ میں نے سنا رضا حیات نے اپنا ٹرانسفر کروالیا ہے۔ وہ سندھ چلے گئے اور اپنے پیچھے اپنے چاہنے والوں کو اس چھوڑ گئے۔

میں نہ کبھی پولیس اسٹیشن گئی۔ نہ کبھی اس ہیٹ اینڈ رن ایکٹیویٹ کی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ قلعہ کے قاتل کو زیادہ سے زیادہ پھانسی مل جاتی؟ ایسے تو وہ اگلے جہاں اپنے گناہ سے پری ہو جاتے۔ میں نے اس کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ قاتل ان کے نامہ اعمال کا واحد گناہ نہیں تھا۔ سو ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرتے ہوئے میں نے یہ دعا کی تھی کہ اللہ ان کے ساتھ انصاف کرے اور انہیں جگہ کا فائدہ کبھی نہ دے۔ یہ دنیا اہلیوں کے لیے سزا کی جگہ نہیں ہے۔

☆☆☆

کلاس میں پن ڈراپ سائیکس تھا، سب دم بخود، بحرزدہ سے سر ہاشم آخدی کو سن رہے تھے۔ وہ ہمارے سائیکالوجی کے نئے پروفیسر تھے۔ اینڈیم، اسٹارٹ، جینٹلس، حاضر جواب اور مہربان۔ وہ سب کچھ تھے۔ کوئی منتر تھا ان کے پاس کہ چند ہی دنوں میں ساری کلاس ان کی طرف کھینچی چلی آئی تھی۔ ان کی گردید ہو گئی تھی۔

”کتنے اچھے ہیں تا سر آخدی.....“ کلاس کے بعد جب میں اپنی کتابیں سیٹ رہی تھی تو میری کلاس لیو قاطمہ یوسف نے آہ بھر کر کہا تھا۔

”ہوں گے۔“ میں نے فائل میں صفحے ترتیب سے لگاتے ہوئے سرسری سا کہا۔

”بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں ملیر، اتنے ایک اور مہربان..... جانتی ہو ان کا تعلق علما کے خاندان سے ہے۔ بلکہ برصغیر میں اسلام کو متعارف ان کے پرکھوں نے ہی کروایا تھا۔“

”میں نے انسانوں سے متاثر ہونا چھوڑ دیا ہے

قاطمہ۔ مجھے یہ سب مت بتاؤ۔ انسان وہ نہیں ہوتے جو دکھائی دیتے ہیں۔“ میں جگ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ قاطمہ نے شکل سے مجھے دیکھا۔

”سب مرد ایک سے نہیں ہوتے۔“

”ہاں، سب مرد ایک سے نہیں ہوتے مگر فارمولا سب پہ ایک ہی اپلائی ہوتا ہے۔ جو محرم ہے، وہ مرد آپ کے لیے اچھا ہے اور جو محرم نہیں ہے، وہ چاہے آپ کو جس رشتے سے بھی پکارے، وہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہو سکتا۔ جو محرم نہیں، اس سے تہائی میں ملنے کی اجازت میرے رب نے نہیں دی۔ چاہے وہ تہائی نیلی فونک گفتگو تک ہو یا کسی پروفیسر کے آفس میں جا کر اس سے ملنے کی حد تک۔ سب مرد ایک سے نہیں ہوتے قاطمہ مگر فارمولا سب پہ ایک ہی اپلائی ہوتا ہے۔“ ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہہ کر میں پلٹ گئی۔ میری بیسائی کی تک تک خالی کلاس روم میں گونجنے لگی۔ میں لنگڑا تے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

میں جانتی ہوں کہ پیچھے بیٹھ پریشانی قاطمہ کو میری بات سمجھ میں نہیں آئی مگر شاید آپ کو آگئی ہو۔ مجھے قہر مت کا یہ اصول اس وقت سمجھ آیا تھا جب میں قلعہ کو کھینچ گئی تھی۔ ہاں میرا عدد گار..... مجازی خدا رضا حیات تھا۔ وہ جس کے صرف خیال نے ہی مجھے باندھ رکھا تھا۔ مجھے اللہ سے دور کر دیا تھا۔

میں نے اس سونے کے پھڑے کو توڑ کر جلا کر نل کے پانیوں میں بہا دیا ہے اور اب میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا آپ کا بھی کوئی ایسا جھوٹا خدا ہے جس نے آپ کو باندھ رکھا ہے اور آپ کو اللہ سے دور کر دیا ہے؟ اگر ہے تو اسے ابھی توڑ ڈالیں۔ نصیحت پھر بعد میں آپ کے پاس نہیں آئے گی..... بعد میں صرف عذاب آتا ہے۔

بھٹنہ